رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۵ عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ٦ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

"اسلامی نظریات اور اسلوب فکر پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جو دسترس حاصل ہے اور جس خوبی سے وہ ان مسائل کو بیان کر گزرتے ہیں وہ دور حاضر میں انہی کا حصہ ہے زیر نظر کتاب در حقیقت موصوف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۳۲-۱۹۳۲ء میں لکھے تھے لیکن کتاب کی شکل میں انکی اشاعت پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ہوئی اب خود مصنف کی نظرثانی کے بعد اسے شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں مختصر طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقاید اور اساسی نظریات کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید اور ضروری ہے اسے پڑھنے کے بعد ایک عام شخص بھی یہ جان سکتا ہے کہ خدا، غیب، انبیاء الٰہی کتابوں، قیامت، موت کے بعد زندگی اور دوسرے بنیادی عقیدے کیوں ہیں۔ کیسے ہونے چاہئیں۔ اور یہ دین کی اساس کیوں کر ہیں؟ اسلام اور قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے اس کتاب میں ہر باشعور آدمی کے لئے اپیل ہے۔ مفہوم بلند اور عالمانہ ہونے کے باوجود انداز تحریر سبک اور شگفتہ ہے۔

پاکستان میں جس کی تشکیل و تعمیر ہی اسلامی عصبیت کی اساس پر ہے ایسی کتابوں کی اشاعت زیادہ سے زیادہ کرنی چاہئے جو دین سے بیگانگی کے رحجانات کا موثر سدباب کر سکیں اور عام خواندہ طبقے کو اسلام سے روشناس رکھ سکیں۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

قیمت مجلد مع دیدہ زیب گرد پوش روپے ۸/۴

ملنے کا پتہ :—

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ

۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	بابت ماہ نومبر ۱۹۶۰ء	جلد ۵۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گزشتہ ترجمان القرآن میں ہم نے عربی مدارس کے نصاب پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ فلسفہ، منطق اور علم الکلام کی جو کتب اس وقت ہمارے دینی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس قدر قدیم ہیں کہ رفتارِ زمانہ نے اُن کی افادیت کو بالکل ختم کردیا ہے اس لیے ان کتابوں کی جگہ ان علوم وفنون کی جدید کتب کو داخلِ نصاب کرنا چاہیے۔ لیکن ان کتابوں کا من وعن داخل کرنا بھی خطرہ سے خالی نہیں۔ سب سے پہلے مغربی علوم وفنون کا سحر توڑنے کی ضرورت ہے۔ ان کا سحر توڑنے کے بعد جب انہیں نصاب میں شامل کیا جائیگا تو پھر انشاء اللہ ان کی افادیت بہت زیادہ ہوگی۔ ہمارے علماء ایک طرف تو جدید رجحانات سے واقف ہونگے اور دوسری طرف وہ ان کا بڑی دیدہ وری سے ابطال بھی کرسکیں گے۔ ہماری انہیں معروضات پر ہمارے ایک کرم فرما نے ہمیں ایک طویل مراسلہ بھیجا ہے، جس میں انہوں نے اسی حصّہ پر بحث کرتے ہوئے یہ دریافت فرمایا ہے کہ ہمارے نزدیک اس سحرِ فرنگ کو توڑنے کی صحیح تدبیر کیا ہے۔ یہ مسئلہ اگرچہ جس تفصیل کا محتاج ہے یہ صفحات اُس کے متحمل نہیں لیکن اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم یہاں قدرے کھل کر بات کرتے ہیں۔

مغرب کا طلسم توڑنے کا ایک عام طریقہ جو ہمارے ہاں سرسیّد سے لیکر آج تک رائج رہا ہے وہ یہ ہے کہ مغربی افکار ونظریات کی مغربی مفکرین اور اہل علم کی آراء سے تردید کی جائے اور انہوں نے اسلامی معتقدات اور شعائر کے بارے جو تعریفی کلمات

ہیں انہیں ہم زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کریں۔ اس طریقہ کی افادیت سے مجھے انکار نہیں۔ اس سے بعض اوقات بڑے ہی مفید نتائج برآمد ہوجاتے ہیں لیکن اپنے تجربہ کی بنا پر بڑے وثوق سے یہ کہ سکتا ہوں کہ یہ ایک چلتا ہوا داؤں ہے جس کی کوئی مستقل اور پائیدار حیثیت نہیں ہوتی۔

جب ایک نوجوان کو کسی مغربی مصنف کا قول سنایا جاتا ہے . وہ نو فوری طور پر تو اس سے بالضرور متاثر ہوتا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس قول کے مخالف بھی تو مغرب کے بہت سے اربابِ علم نے رائے دی ہے۔ پھر آخر اسی ایک قول پر کیوں اعتماد کر لیا جائے۔ اگر مغربی مفکرین کے دوسرے اقوال غلط ہیں تو یہ بھی غلط ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا اس طرزِ استدلال سے جلد ہی اعتماد اٹھ جاتا ہے اور پھر وہ انہی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا ہے جس سے وہ نکلنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔

گزشتہ سولہ برس سے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے وہ نوجوان جو ایف۔ اے تک اسلام کے پُر جوش مبلغ اور فدائی ہوتے ہیں، بی۔ اے اور ایم۔ اے میں پہنچتے ہی اُن کے ایمان میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کے اندر وہ جوش اور جاں نثاری نہیں رہتی جو ابتدائی جماعتوں میں نظر آتی ہے۔ اس تبدیلی میں بلاشبہ بہت سے دوسرے عوامل بھی شامل ہیں اور یہ صورتِ حال بھی سب کے معاملہ میں یکساں پیش نہیں آتی بلکہ بعض سعید روحیں جب ایک مرتبہ اسلام سے وابستہ ہو جاتی ہیں تو پھر اُسی کی ہو کر رہ جاتی ہیں لیکن میرا مشاہدہ یہی ہے کہ ہمارے طلبہ کی اکثریت اسی حادثہ کا شکار ہوتی ہے۔ اس افسوسناک تغیر کی منجملہ وجوہات میں ایک بڑی وجہ وہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ہم جب تک ایک نوجوان کے افکار و نظریات کے لیے کوئی مثبت بنیاد فراہم نہیں کرتے اُس کا فکری جہاز ہمیشہ بے لنگر ہی رہے گا جسے باطل تصورات کی آندھیاں جس طرف چاہیں گی بہا کر

رہ جائیں گی۔ مغربی افکار و نظریات کا سہارا تو محض سلبی سی چیز ہے، جس پر مستقل طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

استدلال کا یہ طریق اگر مفید ثابت ہو سکتا ہے تو اسی حد تک کہ اس کی مدد سے ہم مغربی افکار کے بارے میں اس باطل دعوے کی تردید کر سکتے ہیں کہ اہلِ مغرب کے معتقدات میں اساسی طور پر اتفاق و اتحاد ہے۔ مغرب اس بات کا دعویدار ہے کہ اُس کے نظریات تجربہ اور مشاہدہ کے آفریدہ ہونے کی وجہ سے حتمی اور قطعی ہیں اس لیے ان کے اندر کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ جس طرح سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد کوئی دیدہ ور اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح تجربہ اور مشاہدہ کی اساس پر جن نظریات کی تشکیل ہوئی ہے اُن کے متعلق بھی دو آرا نہیں ہو سکتیں۔ مغربی مفکرین کے اقوال و نظریات کا اگر اختلافی پہلو نمایاں کیا جائے تو اس سے انشاءاللہ مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ جن نظریات کو اہلِ مغرب ایمانیات کی حیثیت سے ہمارے نوجوانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں ان کے اختلافات بیان کرنے سے ان کی یہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور نوخیز نسل پر یہ حقیقت آشکارا ہونے لگتی ہے کہ یہ محض ظن و تخمین کے ڈھکوسلے ہیں جن میں شک و شبہ کی پوری گنجائش موجود ہے اور جن کی صحت کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس طرح ان کا طلسم کسی حد تک ٹوٹ سکتا ہے۔

سحرِ مغرب سے نوجوانوں کو بچانے کے لیے سارے سلبی طریقوں میں سے سب سے مؤثر طریقہ ہمارے نزدیک وہی ہے جس کی طرف شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تصنیف "الفوز الکبیر" کے مقدمہ میں اشارہ فرمایا ہے۔ شاہ صاحب نے اگرچہ یہ ساری بحث یہود، نصاریٰ، مشرکین اور منافقین کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ لیکن اُن کے ارشادات سے آج بھی

پوری طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے اور عہد حاضر کے مادہ پرستوں کے اثرات زائل ہو سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں شاہ صاحب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علمِ اخلاق جو اسلام ہمیں سکھاتا ہے اس کی تعلیم دو طریق سے دینی چاہیے۔ سب سے پہلے ایجابی طور پر لوگوں کو شریعت کے اوامر و نواہی سے روشناس کرایا جائے۔ دوسرے سلبی طور پر اُن اخلاقِ حمیدہ کے تارکین کی زندگی میں جو معائب پیدا ہوتے ہیں اُن کی تفصیل بیان کی جائے۔ شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے بتاتے ہوئے اس دوسرے طریقے کو اگر پوری ذہانت سے آزمایا جائے تو لوگوں کے دلوں سے مغرب کی برتری بالکل ختم ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی نوخیز نسل کو یہ بتانے کی کوشش کریں کہ جن افکار و نظریات پر تم مٹے جا رہے ہو اُن کو جب دنیا میں بالفعل نافذ کیا گیا تو کونسے خطرناک نتائج برآمد ہوئے۔ کسی نظریہ کی محض ظاہری آب و تاب دیکھ کر اُس سے مرعوب ہو جانا کوئی صحیح چیز نہیں بلکہ اُس کی صحت کا اصل معیار وہ سوسائٹی ہے جس کی وہ نظریہ تشکیل کرتا ہے۔ کسی نظریہ کی صحت کو پرکھنے کا یہ فلسفہ عملیت (PRAGMATISM) نوجوانوں کے لیے بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

اسلام کو دنیا میں مقبول بنانے کے لیے جتنی تدابیر کی جائیں اُن میں نتیجہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ خطرناک تدبیر یہ ہے کہ اسلام کو کھینچ تان کر مغربی افکار و نظریات کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے یا اس میں سے وہ چیزیں نکالی جائیں جو فی الواقع اس میں موجود نہیں یا اس کے اندر اُن کاموں کا جواز ڈھونڈا جائے جنہیں یہ دنیا سے مٹانے کے لیے آیا تھا۔ دین کے معاملے میں جن لوگوں نے بھی یہ روش اختیار کی ہے اُن کی نیتیں خواہ کتنی ہی اچھی اور آرزوئیں خواہ کتنی ہی مقدس ہوں لیکن یہ دین کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے سحر ٹوٹتا نہیں بلکہ اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہو جاتی ہے۔

اس کا سب سے پہلا اثر انسان کے ذہن پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ معیارِ حق اُسی نظامِ حیات کو سمجھتا ہے جس کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے دین کے اندر قطع و برید کی جارہی ہے۔ یہ چیز فطرت کے عین مطابق ہے۔ جب آپ ایک نظامِ حیات کے اندر محض اس لیے تبدیلیاں شروع کردیں کہ وہ ایک غالب نظام کے موافق اور مطابق بن جائے تو انسان کے دل میں بالکل قدرتی طور پر اُسی نظام کی برتری کا نقش ثبت ہوتا ہے جس کے مطابق دوسرے نظام کو ڈھالا جارہا ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے نظام سے چمٹے رہنے کے لیے اپنے دل کو یہ تسلی ضرور دے سکے گا کہ میرا نظام بھی اسی طرح کا ہے لیکن اُس کے دل میں حقیقی عظمت اُسی آئیڈیل نظام کی ہوگی جس پر وہ اپنے دین کو پرکھ رہا ہے۔

گذشتہ دو سو برس میں مسلمانوں نے اس قسم کی جتنی کوششیں کی ہیں اُن سے دین کو فائدہ حاصل ہونے کی بجائے سخت نقصان پہنچا ہے۔ سرسیّد مرحوم اور اس کے ساتھیوں کے اس معذرت خواہانہ طرزِ عمل نے مغربی افکار و نظریات کو دین کے اندر داخل ہونے کے مواقع فراہم کیے، اور لوگوں کے دلوں میں بالکل غیر محسوس طور پر مغرب کی برتری کا احساس پیدا ہوتا گیا۔ آپ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی اچھی سے اچھی کتاب کا مطالعہ کریں اور پھر دیکھیں کہ کیا اُسے پڑھنے کے بعد مغرب کا طلسم ٹوٹتا ہے اور دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کو ہی دنیا میں ایک طاقتور قوت بننا چاہیے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک اس قسم کے جتنے حضرات سے ملنے کا موقع ملا ہے اُن کے ذہنی تاثرات کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں: "مغرب نے بڑی ترقی کی ہے اور یہ سب اسلامی تعلیمات کا اثر ہے۔ مگر افسوس کہ "ملّا" نے ان رازوں کو ہم سے چھپا کر رکھا۔ اب ہمیں مغرب سے یہ نظریات لے لینے چاہئیں۔ دراصل مغربی نظام اسلام کا ہی ایک ترقی یافتہ ایڈیشن ہے"

اس ذہنی ساخت کے ساتھ آپ خود ہی غور کریں کہ انسان کے دل میں اس دینِ حق کو

تمام ادیان پر غالب کرنے کا داعیہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اس رعایت کا طالب ہوتا ہے کہ اُسے اس دین کے نام لیوا کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جاتے اور وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ اس میں کوئی ذاتی کشش ہے بلکہ محض اس بنا پر کہ اس دین میں اور مغرب میں کوئی جوہری اختلاف نہیں اس لیے اس کا ترک کرنا جذبات کے نقطۂ نگاہ سے تکلیف دہ ثابت ہوگا۔

دین سے یہ جذباتی لگاؤ بھی صرف ایک دو نسلوں تک محدود ہوتا ہے اور اُن کے چلے جانے کے بعد جب کچھ زیادہ روشن خیال لوگ معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں تو یہ معمولی سا تعلق بھی باقی نہیں رہتا اور نوجوان بڑی بیباکی کے ساتھ دین کا لبادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکتے ہیں۔ وہ برملا کہتے ہیں کہ معیارِ حق جب مغرب ہے تو پھر اسلام کو درمیان میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کون اسلامی تعلیمات کی ان درمیانی الجھنوں سے گزرتا ہوا منزلِ مقصود تک پہنچے۔ یہ سب بیکار کی زنجیریں ہیں جن سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ہی معاشرے کے لیے مفید ہے۔ آج کا نوجوان اسلام سے جس طرح بدظن ہو رہا ہے اُس میں کافی دخل ہماری اس غیر دانشمندانہ روش کا بھی ہے جسے ہم چند سال پیشتر اسلام کے لیے سراپا خیر سمجھتے تھے

یہ معاملہ صرف اسلام تک ہی محدود نہیں، تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مذہب کی ساری وہ تعبیریں جو مادی ماحول سے متاثر ہو کر کی گئیں، انہوں نے وقتی طور پر تو مذہب کو کچھ سہارا دیا مگر جلد ہی اس کی تباہی و بربادی کا سبب بھی بنیں۔ اہل زمانے عیسائیت کو قبول کیا کہ جب اسے اپنے مادہ پرستانہ افکار سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تو اس سے بت پرستی، شاہ پرستی اور طبقاتی تقسیم نے جنم لیا اور عیسائیت نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی جو مذہب سے زیادہ الحاد سے ملتی جلتی تھی۔ جس میں تعلق باللہ برائے نام رہ گیا اور مذہبی

لوگ انہی گندگیوں سے ملوث ہوئے جن سے دنیا پرست آلودہ تھے۔

مارٹن لوتھر اور اس کے رفقائے کار کی کوششیں اس ضمن میں بڑی عبرتناک ہیں۔ عوام مارٹن لوتھر کو بے شک عیسائیت کا ہیرو کہتے رہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس شخص نے عیسائیت کو بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ سب اسی مادہ پرستانہ طرز فکر کا کرشمہ ہے کہ آج کا عیسائی سوائے سیاسی مفادات کے حصول کے مذہب سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اپنے آپ کو بالکل آزاد سمجھتا ہے اور مذہب کی کسی پابندی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ ایسی کسی پابندی پر غور کرنے کو بھی انسانیت کی توہین خیال کرتا ہے۔ لوتھر کے غلط طرزِ استدلال نے مسیحی دنیا کی وحدت کو پارہ پارہ کیا اور عیسائیوں کے دل و دماغ میں اس باطل تصوّر کی آبیاری کی کہ وہ مذہب کو اپنی قومیت کی بنیاد بنانے کی بجائے وطن کو اس کی اساس بنائیں۔ اس تبدیلی سے انسان اور انسان کے درمیان سارے مقدس اور لطیف رشتے ٹوٹ گئے اور انسان محض مادی فوائد و لذائذ کے حصول کے لیے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

پھر اسی کے نظریات و افکار نے انسان کو اپنے سفلی جذبات کی پرستش کی ترغیب دی اور اسے محض ایک حیوان ناطق بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کی ساری اعلیٰ اور ارفع اقدار جو درحقیقت انسانیت کا جوہر ہیں وہ سب آہستہ آہستہ مفقود ہو گئیں۔ آپ اگر حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے پرستاروں اور ان کے انکار کرنے والوں کی زندگیوں کا جائزہ لیں تو آپ ان کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے۔ سوائے نام کے اب ان کے مابین اور کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں رہی۔ اگر مسیحیت کے اندر یہ تحریف نہ ہوتی تو جو لوگ فی الواقع عیسائی رہنا چاہتے تھے وہ اتنے بے راہ رو نہ ہوتے جتنے کہ یہ لوگ آج ہیں۔ عیسائیت کے اندر اس کے کرم فرماؤں نے ساری وہ چیزیں شامل کر دی ہیں جو مادہ پرستی میں ہو سکتی ہیں اس لیے یہ لوگ عیسائی ہونے

کے باوجود ہر کام کو بڑی آزادی سے کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں بھی بدقسمتی سے اسی قسم کی کوششیں ایک لگے بندھے منصوبے اور پلان کے تحت جاری ہیں اور غلط فہمی سے اس "اعتزال" کو خدمتِ دین سمجھ لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس روش کے بُرے انجام سے بچاتے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان اگر ایک مرتبہ اس راہ پر چل پڑے تو پھر وہ الحاد اور کفر کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مسلمانوں کو مغربی نظامِ حیات کا مقلد بنانے کے لیے دین کے اندر جس قسم کی تبدیلیاں پیدا کی جارہی ہیں وہ اگر خدانخواستہ کامیاب ہوگئیں تو پھر دین کی پوری عمارت ہی منہدم ہو جائے گی۔

اس طرزِ فکر سے انسانی ذہن پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ہم یہاں اُس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں:

روس کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے قوموں کے اندر اپنے ذرائع و وسائل کو حکومت کی تحویل میں دینے کا ایک عام رجحان پیدا کر دیا ہے۔ اب ایک صاحب اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں، کیونکہ زمین ساری اللہ کی ہے اور زمین سے علمِ معیشت میں مراد قدرت کے وہ عطیات ہیں جن سے انسان رزق کا سامان حاصل کرتا ہے اس لیے شخصی ملکیت کا نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے اور قرآن ہم پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ ہم سارے وسائلِ رزق کو حکومت کے حوالے کر دیں اور حکومت ہمیں جتنا نپا تُلا چارہ دیتی رہے اُسی پر گزر اوقات کریں۔

اس نظریہ میں چونکہ اس وقت کشش کے بہت سے پہلو موجود ہیں، ایک تو اس بنا پر کہ یہ دنیا کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا نظریہ ہے، اور دوسرے سرمایہ داری کے مظالم سے ستائی ہوئی مخلوق کچھ تبدیلی چاہتی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ چند نیم خواندہ نوجوان خود اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اور مفکرِ قرآن کی اس "نکتہ وری" پر دل طول کر داد دیں۔ پھر یہ معلوم

ہونے پر کہ اُن کے دلپسند انکار کی قرآن مجید بھی تائید کرتا ہے، اُن کے اندر کلام پاک سے ایک وقتی سا تعلق بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ اُن کی دلچسپی کا اصلی مرکز کتاب الٰہی نہیں بلکہ قومی ملکیت کا وہ فلسفہ ہے جسے وہ قرآن میں محفوظ پاتے ہیں۔

انسانی فکر کوئی غیر متحرک چیز نہیں کہ وہ اسی مقام پر آکر رک جائے۔ وہ جب آگے بڑھتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے قومی ملکیت کے بارے میں جو یہ طرز عمل اختیار کیا ہے وہ باقاعدہ ایک مادہ پرستانہ فلسفے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ وہ اس فلسفے کی پوری تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے کہ یہ تبدیلی فرد اور جماعت کے باہمی تعلق کے تغیر سے وابستہ ہے انسان نے جب بھاپ سے کام لینا شروع کیا تو پیداوار وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔ جو لوگ گھروں میں اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے وہ کارخانوں میں آکر بے بس غلام بن گئے۔ انسانوں کے اس ریوڑ کے مقابلے میں سرمایہ اور مشین کی اہمیت بڑھنے لگی۔ بالآخر انسان نے یہ طے کیا کہ ان دو چیزوں کی ہر قیمت پر حفاظت اور پاسبانی کی جانی چاہیے اور فرد کو جتنا بے بس اور کمزور کیا جائے گا اتنا ہی وہ اس فرض کو بخوبی سرانجام دے سکے گا۔ اس لیے فرد کے مقابلہ میں اجتماعیت کو پورے اختیار سونپ دیئے گئے اور اس اجتماعیت کا دائرہ پھیلتے پھیلتے ساری ریاست پر محیط ہو گیا۔ فکر و نظر کی اس تبدیلی کا محرک چونکہ ذرائع پیداوار کے تغیرات ہیں اس لیے اس فلسفہ کے حامیوں نے تاریخ کے متعلق بھی یہ قطعی فیصلہ کر دیا کہ انسانیت آج تک جتنے انقلابات سے گزری ہے وہ سب ذرائع پیداوار کی تبدیلیوں کا مظہر ہیں اور انسانیت نے قانون و اخلاق، تمدن و سیاست، مذہب اور اخلاق کے جو مختلف پیکر تیار کیے ہیں وہ سب ذرائع پیداوار کے سانچوں میں ڈھلے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ جب ایک نوجوان کی نگاہ میں نیشنلائزیشن کے عملی پہلو بھی

سامنے آئیں گے کہ اس سے ایک ایسا نظام معرضِ وجود میں آتا ہے جو سیاسی اعتبار سے ایک انتہائی ظالمانہ ڈکٹیٹرشپ کو جنم دیتا ہے۔ جسے کامیابی سے چلانے کے لیے ذرائع پیداوار کی منصوبہ بندی کے علاوہ جذبات و احساسات کی بھی منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے، جس میں فرد کے روحانی ارتقاء کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ جب تک ایک شخص کو آزادی کے ساتھ اپنا لقمۂ رزق کمانے کا موقع بہم نہیں پہنچتا اس کا ذہن آزادی سے سوچ بھی نہیں سکتا۔ تو ان سب حقائق کے سامنے آجانے کے بعد وہ اُن کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرے گا۔ اس کا اثر لازمی طور پر یہ ہوگا کہ وہ نہ صرف اس نظام سے بغاوت پر آمادہ ہوگا بلکہ اُس قرآن پر سے بھی اُس کا اعتماد جاتا رہے گا جو ایسی غلط باتوں کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ تو معاملے کا صرف ایک پہلو ہے۔ ایک انسان جب اجتماعیت پرستی کے اس فلسفہ کا دوسرے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کرتا ہے تو صورتِ حال اس سے بھی بدتر پاتا ہے۔ وہ غور و فکر کے بعد خود بخود اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر فرد کا مصرف صرف اسی قدر ہے کہ اسے اجتماعیت کی خواہشات پر بھینٹ چڑھا دیا جائے اور اس کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں تو پھر اسے خالقِ کائنات کی بجائے اپنی قوم کے سامنے سجدہ ریز ہونا چاہیے۔ اس نظریہ کو اپنانے کے بعد وہ اپنی قوم کو اپنا معبود بنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ جرمنی میں ہٹلر، روس میں سٹالن اور جاپان میں شنٹو کے اندر الوہیت کی جو شان پیدا کی گئی ہے وہ اسی طرزِ فکر کا مظہر ہے۔ اس کے نتیجے میں کسی قوم کے افراد یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اُن کی زندگی کا منتہائے مقصود اُن کی روحانی اور اخلاقی ترقی نہیں بلکہ قوم کی اجتماعی فلاح ہے اور فلاح سے بھی اُن کی مراد صرف مادی خوشحالی ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نقطۂ نظر ایک ذہین انسان کے لیے زیادہ دیر تک قابلِ کشش نہیں رہ سکتا۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر فرد

معاشرے کے ہاتھ میں اتنا ہی بے بس ہے اور اس کی حیثیت ایک بے حس مشین میں پرزے سے زیادہ کچھ بھی نہیں تو پھر انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے۔

اس کے بعد وہ ذہین نوجوان تاریخ کے اوراق الٹتا ہے اور دیکھتا ہے کہ قوت کا یہ مجنونانہ ارتکاز خود اتنا ظالمانہ عمل ہے کہ انسانیت اسے عرصہ دراز تک برداشت نہیں کرسکتی اس کے خلاف چند ہی سالوں کے بعد ایک شدید ردعمل شروع ہوتا ہے اور پھر لوگ انفرادیت کی طرف جھک جاتے ہیں۔ رومیوں کے دورِ عروج میں قوت و طاقت جس غلط طریق سے سمٹ کر حکومت کے قبضے میں چلی گئی تھی اسی نے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور ان کے زوال کے بعد نہ صرف عظیم الشان سلطنت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی بلکہ لوگوں پر رہبانیت کا بھی ایسا جنون سوار ہوا کہ اس کی یاد سے آج بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ ایک انسان جب مسلسل مطالعہ اور غور و فکر کے بعد زمان و مکان کی تنگ دامانیوں سے نکل کر انسانیت کی پوری تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ اجتماعیت پرستی کا یہ مسلک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے اگرچہ آجکل مادہ پرستی نے بام بلند پر پہنچا دیا ہے لیکن یہ عروج ہی اس کے فنا کا پیش خیمہ بھی ہے۔ اسے بہرحال دنیا سے ٹلنا اور فنا ہونا ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ جب قرآن مجید سے اس غلط قسم کی اجتماعیت پرستی کو برحق ثابت کیا جائے گا تو ایک صاحبِ عقل خود قرآن پاک کے متعلق کیا رائے رکھیگا۔ کیا ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی وہ قرآن پاک پر ایمان لاسکتا ہے! اجتماعیت پرستی کے اس نظریہ کے مفاسد کو جاننے کے بعد وہ ان ساری چیزوں سے انکار کر دیگا جو اس کی تائید کرتی ہیں اور جتنی کوئی چیز زیادہ مقدس ہوگی اتنا ہی وہ اس سے زیادہ بدظن ہوگا۔

اسلام کی ازلی اور ابدی اقدار کو وقتی تحریکات سے متاثر ہو کر زمان و مکان کی

حدود میں مقید کر دینا اسلام کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے۔ اسلام ایک میزانِ عدل ہے جس کی مدد سے افکار و اعمال کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اگر کوئی اسلام کا نادان دوست ان باطل تصورات کو معیارِ حق سمجھ کر دین کی میزانِ عدل میں اس طرح کی تبدیلیاں کرتا ہے کہ جن سے یہ غلط معتقدات تول میں پورے اتر سکیں تو یہ اس "میزانِ عدل" کے ساتھ صریح ظلم اور زیادتی ہے اور کسی فرد یا گروہ کا یہ فعل خواہ کتنا ہی نیک نیتی پر مبنی ہو۔ اس میزان سے لوگوں کو یقینی طور پر برگشتہ کر دیگا۔ جب لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ اس میزان کے پلڑوں کو ذاتی خواہشات اور وقتی تقاضے جس طرف چاہیں جھکا سکتے ہیں تو پھر وہ اسے خدائی میزان ماننے پر کیونکر تیار ہو گا، بلکہ لوگ اسے بھی ایک سیاسی اور معاشی فریب کاری سمجھیں گے جسے بڑی ہوشیاری کے ساتھ میزانِ الٰہی کا نام دے دیا گیا ہے۔

اسلام کے اندر یُوں تو ہر قسم کی تبدیلی سخت خطرناک ہے لیکن اس تبدیلی کے محرکات جب مادّی ہوں تو پھر یہ تغیرات اس دین کی بربادی کا پیغام ہیں۔ اسلام نے بلا شبہ حیاتِ انسانی کے مادّی تقاضوں سے صرفِ نظر نہیں کیا لیکن یہ تقاضے اس کی اساس اور بنیاد نہیں۔ اس دین کی بنیاد تعلق باللہ اور خوفِ آخرت پر رکھی گئی ہے۔ یہاں رضائے الٰہی ہی ایک انسان کا مقصود و مطلوب ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسلام کے اندر اس طرح کی تبدیلیاں کرتا ہے کہ رضائے الٰہی کی جگہ طلبِ دنیا اس کا نصب العین قرار پائے تو اس کے بعد وہ شخص جلد ہی الحاد کی آغوش میں چلا جائے گا۔ آج تک دنیا میں جب کبھی لوگ اس عزم کے ساتھ اُٹھے کہ مذہب کو وقت کی مادّی تحریکات کے تابع کر دیا جائے تو ان کے چلے جانے کے بعد لوگوں کے اندر بڑی بے دینی پھیلی۔ مارٹن لوتھر کے انتقال کے کچھ مدت بعد یورپ میں جس سرعت کے ساتھ الحاد اور زندقے کو فروغ حاصل ہوا وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔

آج اگر عیسائیت کا یورپ میں کچھ غلغلہ ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہاں کے عوام کو عیسائیت سے محبت ہے یا وہ اس کی پابندیاں برداشت کرنے میں گوناگوں راحت محسوس کرتے ہیں۔ وہ اگر عیسائیت کے نام لیوا ہیں تو صرف اس لیے کہ اُن کا مذہب اب اتنا تغیر پذیر ہے کہ ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور اُس کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ اس میں کفر اور الحاد تک بھی بڑی آسانی کے ساتھ سما سکتے ہیں۔ اس لیے اہلِ مغرب اب لا مذہب ہونے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ عیسائیت اگر اُن کی خواہشات کی راہ میں کسی طرح بھی مزاحم ہوتی تو وہ اسے مدت سے خیرباد کہہ چکے ہوتے۔

خود ہمارے ہاں گزشتہ صدی میں سرسیّد مرحوم کی ذرا سی لغزش نے ہمارے لیے ایسے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے ہیں کہ ہم ان کو آج تک سلجھا نہیں سکے۔ اُس بیچارے نے تو خیر اسلام اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے بعد نیچریت نے اپنی راہ ہموار کرنی شروع کی اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، بڑے بڑے علماء تک اس سے متاثر ہوئے۔ پھر یہاں فتنۂ انکارِ حدیث پھیلا۔ اور سائنس تو ایک طرف رہی، مسلمانوں کے تجدّد پسند طبقے نے اسلام کے دروازے اُن ساری گمراہیوں کے لیے کھول دیئے جنھیں اللہ تعالیٰ کا یہ آخری دین دنیا سے مٹانے کے لیے آیا تھا۔ آج اسلام کے نام پر اس ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کچھ یورپ کی مادی تحریک سے ذہنی مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ یہ تو خدا کا خاص فضل ہوا کہ علمائے حق نے اس خطرے کو بروقت بھانپ لیا اور اس کے اثرات کو مٹانے کی کوشش کی۔ لیکن اگر یہ طرزِ فکر کامیاب ہو جاتا تو آج اسلام بھی اُسی پست مقام پر ہوتا جس پر آج کل عیسائیت ہے۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم، ہمیں دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سے مؤدبانہ

گذارش یہ کرنا ہے کہ وہ خدارا اس فریب میں نہ آئیں کہ اسلام کے اندر مغربی افکار و نظریات داخل کرنے سے، یا اس دینِ حق کو مغربی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ کرنے سے اس دین کو قوت و طاقت فراہم ہو گی اور وہ مغرب کے بڑھتے ہوئے الحاد اور مادہ پرستی کا کامیابی سے مقابلہ کر سکے گا۔ ممکن ہے آپ ایک نیم خواندہ نوجوان کو کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ کی آیت سنا کر وقتی طور پر یہ باور کرا سکیں کہ قرآن بھی نظریۂ ارتقاء کی تائید کرتا ہے۔ اور یہ صرف ڈارون اور ہیگل کے ذہن کی کرشمہ سازی نہیں، سُود کو پیداواری اور غیر پیداواری کاموں میں تقسیم کر کے لوگوں کی کاروباری ضروریات کے پیشِ نظر اس کے جواز کا فتویٰ دیکر خراجِ تحسین بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تحدیدِ نسل کو بھی امت کے اجتماعی مفاد کے نام پر جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے لیکن یہ محض فریبِ نظر ہے جس سے کچھ مدت تک تو لوگوں کو دھوکہ دینا ممکن ہے لیکن حقیقت جلد ہی بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ اور لوگوں پر جب ایک مرتبہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے تو پھر وہ ان نظریات سے اور ان کی تائید کرنے والے افکار سے اس حد تک متنفر ہو جاتے ہیں کہ الحاد سے کم کسی مسلک کو قبول نہیں کرتے۔

مغرب کے یہ سارے نظریات اپنی پشت پر مادہ پرستانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ ڈارون اور ہیگل کے افکار کو لوگ اس بنا پر نہیں مانتے کہ وہ کوئی ایسی بڑی صداقتیں ہیں جنہیں جھٹلانا ناممکن ہے۔ اہلِ مغرب ان پر اس لیے ایمان رکھتے ہیں کہ ان کی مدد سے وہ معاشی کشمکش کے لیے وجہِ جواز فراہم کر سکتے ہیں، ہیگل مادہ پرستی کے تاریک مستقبل کو روشن بناتا ہے، سُود اجتماعیت کو طاقتور بنانے کا مؤثر ذریعہ ہے، تحدیدِ نسل کو مالتھس کے نظریۂ آبادی نے جنم دیا ہے اور یہ نظریہ خالقِ کائنات کے متعلق نہایت گمراہ کن تصورات پیدا کرتا ہے۔ اس کے پس پردہ جو ذہنیت کام کرتی ہے وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ معاذ اللہ بڑا بخیل اور بے رحم ہے اور اُس نے انسانوں کے ساتھ بڑا شرمناک سلوک روا رکھا ہے۔ اُس نے انسانوں کے اندر جس سرعت کے ساتھ بڑھنے کی صلاحیت رکھی ہے خوراک کو اس تناسب سے بڑھانے کا انتظار نہیں کیا۔ اس

وجہ سے یہ روش بنیادی طور پر غلط ہے کہ مغربی تہذیب کے ان باطل تصورات کی تائید میں قرآن مجید کو محض اس لیے کھڑا کیا جاتا ہے کہ ان افکار کو آج کل قبولِ عام حاصل ہے اور ایسا کرنے سے ہم نوجوان نسل کو کفر و الحاد سے بچا سکیں گے۔ مغربی طلسم کو توڑنے کا صحیح طریقہ وہی ہے جو ہمارے بزرگوں نے اپنے عہد کے طلسمات کو توڑنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو وقتی تقاضوں سے متاثر ہوئے بغیر جوں کا توں پیش کیا۔ ان میں نہ تو اپنی طرف سے کوئی کمی کی اور نہ بیشی اور اس طرح اسلامی اقدارِ حیات کی مستقل اور پائیدار حیثیت کو پوری طرح برقرار رکھا لیکن دین کی حفاظت اور پاسبانی کے ساتھ ساتھ بر خلقتنے کو مٹانے کی بھی پوری پوری کوشش کی۔ انہوں نے دینی حصار میں قطعاً کوئی شگاف نہ پیدا کیا بلکہ اگر کوئی پیدا بھی ہو چکا تھا تو اسے بڑی مضبوطی کے ساتھ بند کیا اور آگے بڑھ کر باطل افکار و نظریات پر بالکل جدید اسلحہ سے مسلح ہو کر اس قوت کے ساتھ حملہ کیا کہ باطل کو کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملی اور وہ حرفِ غلط کی طرح دنیا سے مٹا دیا گیا۔

دور نہ جائیے، اپنے اس ملک کے نامور مفکر حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کے کارناموں پر آپ نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ باطل کا کونسا پہلو ہے جس پر انہوں نے بھرپور تنقید نہیں کی۔ افکار و نظریات کے بنیادی مسائل سے لیکر اعمال کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ان کی گرفت میں آگئیں۔ انہوں نے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح فساد کے ایک ایک مرکز کو تلاش کیا اور بڑے حکیمانہ طریق سے اس پر نشتر لگا کر امتِ مسلمہ کے جسم سے فاسد مادہ کو خارج کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی ساری کتب کا مطالعہ کر جائیے آپ کو کہیں اس امر کا نشان نہیں ملیگا کہ وہ وقت کے فلسفوں سے مرعوب ہو کر دین میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ انکی تصانیف ان مکان کے خوشنما کی گندگی سے یکسر پاک اور صاف ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جب امن و امان اس ملک سے رخصت ہو رہا تھا اور مغربی تہذیب سرعت کے ساتھ ہندوستان کی طرف قدم بڑھا رہی تھی ایسے پر آشوب حالات میں اپنے دین پر اتنا غیر متزلزل ایمان ہی شاہ صاحب کی عظمت کی سب سے بڑی شہادت ہے اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

تفہیم القرآن

الرُّوم

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ غُلِبَتِ الرُّومُ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول | آغاز ہی میں جس تاریخی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس سے زمانۂ نزول قطعی طور پر متعین ہو جاتا ہے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں"۔ اُس زمانے میں عرب سے متصل رومی مقبوضات اُردن، شام اور فلسطین تھے۔ ان علاقوں میں رومیوں پر ایرانیوں کا غلبہ ۶۱۵ء میں مکمل ہوا تھا۔ اس لیے پوری صحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ اُسی سال نازل ہوئی تھی، اور یہ وہی سال تھا جس میں ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔

تاریخی پس منظر | جو پیشین گوئی اس سورے کی ابتدائی آیات میں کی گئی ہے وہ قرآنِ مجید کے کلامِ الٰہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسولِ برحق ہونے کی نمایاں ترین شہادتوں میں سے ایک ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن تاریخی واقعات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے جو ان آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (MAURICE) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (PHOCAS) تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا۔ اس شخص نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ

بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں بر سر عام ٹنکوا دیئے۔ اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو روم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اخلاقی بہانا مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا محسن تھا۔ اُسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا۔ اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ روم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں اڈیسیا (موجودہ اورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ روم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اس نے اپنے بیٹے ہرقل (HERACLIUS) کو ایک طاقت ور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرقل قیصر بنایا گیا، اور اس نے برسرِ اقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے، اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوت پر سرفراز ہوئے تھے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے

جن فرقوں کو رومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے ملحد قرار دیکر سالہا سال سے تختۂ مشق ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں۔ اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آکر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھادی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا، کنیسۃ القیامہ (HOLY SEPULCHRE) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

"سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام۔

تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟"

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدود مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ

وہ زمانہ تھا جب مکّہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو روم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکّے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بُت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے"۔ اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا، دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دور دور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشینگوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکّے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشینگوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضے میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب

پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (CHALCEDON۔موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کرلیا۔قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابزنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوند آتش کی بندگی نہ اختیار کرے"۔ آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہوگیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (CARTHAGE -موجودہ ٹیونس) منتقل ہوجانے کا ارادہ کرلیا۔
غرض انگریز مؤرخ گبن کے بقول، قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کرسکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائیگی، بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفار مکہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور اُبَیّ بن خَلَف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اونٹ میں دونگا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہونگے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آئے ہیں، اور عربی زبان میں بِضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کردو۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے اُبَیّ سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سو اونٹ

دے گا۔

۶۲۲ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور اُدھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہوا جہاں اُس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اسقف اعظم سرجیس (SERGIUS) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ (CLORUMIA) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشینگوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہو گئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہان ایران کی قیام گاہ دستگرد (دستکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہرقل کے لشکر عین طیسفون (CTESIPHON) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیئے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حدیبیہ

واقع ہوئی جسے قرآن "فتح عظیم" کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں خسرو کے بیٹے قباذ ثانی نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر "مقدس صلیب" کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اُبَی بن خلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اونٹ ابوبکر صدیقؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ شرط اس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حرمت کا حکم آ چکا تھا۔ اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

موضوع اور مضمون اس سورہ میں کلام کا آغاز اس بات سے کیا گیا ہے کہ آج رومی مغلوب ہو گئے ہیں اور ساری دنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ اس سلطنت کا خاتمہ قریب ہے، مگر چند سال نہ گزرنے پائیں گے کہ پانسہ پلٹ جائے گا اور جو مغلوب ہے وہ غالب ہو جائے گا۔

اس تمہید سے یہ مضمون نکل آیا کہ انسان اپنی سطح بینی کی وجہ سے وہی کچھ دیکھتا ہے جو بظاہر اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، مگر اس ظاہر کے پردے کے پیچھے جو کچھ ہے اس کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ یہ ظاہر بینی جب دنیا کے ذرا ذرا سے معاملات میں غلط فہمیوں اور غلط اندازوں کی موجب ہوتی ہے، اور جبکہ محض اتنی سی بات نہ جاننے کی وجہ سے کہ "کل کیا ہونے والا ہے" آدمی غلط تخمینے لگا بیٹھتا ہے، تو پھر

بحیثیت مجموعی پوری زندگی کے معاملے میں ظاہرِ حیاتِ دنیا پر اعتماد کر بیٹھنا اور اسی کی بنیاد پر اپنے پورے سرمایۂ حیات کو داؤں پر لگا دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔

اِس طرح روم و ایران کے معاملے سے تقریر کا رُخ آخرت کے مضمون کی طرف پھر جاتا ہے اور مسلسل تین رکوعوں تک طریقے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آخرت ممکن بھی ہے، معقول بھی ہے، اس کی ضرورت بھی ہے، اور انسانی زندگی کے نظام کو درست رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ آدمی آخرت کا یقین رکھ کر اپنی موجودہ زندگی کا پروگرام اختیار کرے، ورنہ وہی غلطی واقع ہو گی جو ظاہر پر اعتماد کر لینے سے واقع ہوا کرتی ہے۔

اس سلسلے میں آخرت پر استدلال کرتے ہوئے کائنات کے جن آثار کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے وہ بعینہٖ وہی آثار ہیں جو توحید پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ اس لیے چوتھے رکوع کے آغاز سے تقریر کا رُخ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کی طرف پھر جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ انسان کے لیے فطری دین اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ بالکل یکسو ہو کر خدائے واحد کی بندگی کرے۔ شرک فطرتِ کائنات اور فطرتِ انسان کے خلاف ہے، اسی لیے جہاں بھی انسان نے اس گمراہی کو اختیار کیا ہے وہاں فساد رونما ہوا ہے۔ اس موقع پر پھر اُس فسادِ عظیم کی طرف، جو اُس وقت دنیا کی دو سب سے بڑی سلطنتوں کے درمیان جنگ کی بدولت برپا تھا، اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ فساد بھی شرک کے نتائج میں سے ہے اور پچھلی انسانی تاریخ میں بھی جتنی قومیں مبتلائے فساد ہوئی ہیں وہ سب بھی مشرک ہی تھیں۔

خاتمۂ کلام پر تمثیل کے پیرایہ میں لوگوں کو سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مردہ پڑی ہوئی زمین خدا کی بھیجی ہوئی بارش سے یکایک جی اٹھتی ہے اور زندگی و بہار

کے خزانے اگلنے شروع کر دیتی ہے، اسی طرح خدا کی بھیجی ہوئی وحی و نبوت بھی مردہ پڑی ہوئی انسانیت کے حق میں ایک بارانِ رحمت ہے جس کا نزول اس کے لیے زندگی اور نشو و نما اور خیر و فلاح کا موجب ہوتا ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ گے تو یہی عرب کی سوکھی زمین رحمتِ الٰہی سے لہلہا اٹھے گی اور ساری بھلائی تمہارے اپنے لیے ہی ہو گی۔ اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، پھر پچھتانے کا کچھ حاصل نہ ہو گا اور تلافی کا کوئی موقع تمہیں میسر نہ آئے گا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

ا-ل-م- رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں، اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔[۱] اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد

[۱] ابن عباسؓ اور دوسرے صحابہ و تابعین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ روم و ایران کی اس لڑائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ اور کفارِ مکہ کی ہمدردیاں ایران کے ساتھ تھیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ ایک یہ کہ ایرانیوں نے اس لڑائی کو مجوسیت اور مسیحیت کی لڑائی کا رنگ دے دیا تھا اور وہ ملک گیری کے مقصد سے تجاوز کر کے اسے مجوسیت پھیلانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔ بیت المقدس کی فتح کے بعد خسرو پرویز نے جو خط قیصرِ روم کو لکھا تھا اس میں صاف طور پر وہ اپنی فتح کو مجوسیت کے برحق ہونے کی دلیل قرار دیتا ہے۔ اصولی اعتبار سے مجوسیوں کا مذہب مشرکینِ مکہ کے مذہب سے ملتا جلتا تھا، کیونکہ وہ بھی توحید کے منکر تھے، دو خداؤں کو مانتے تھے اور آگ کی پرستش کرتے تھے۔ اس لیے مشرکین کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ ان کے مقابلہ میں مسیحی خواہ کتنے ہی مبتلائے شرک ہو گئے ہوں، مگر وہ خدا کی توحید کو اصلِ دین مانتے تھے، آخرت کے قائل تھے، اور وحی و رسالت کو سرچشمۂ ہدایت تسلیم کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کا دین اپنی اصل کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین سے مشابہت رکھتا تھا، اور اسی لیے مسلمان فطرتی طور پر ان سے ہمدردی رکھتے تھے اور ان

ہیں[۲]۔ اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے[۳]۔ اللہ نصرت
عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے، اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا
ہے، اللہ کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔
لوگ دنیا کی زندگی کا بس ظاہری پہلو دیکھتے ہیں اور آخرت سے وہ خود ہی غافل

مشرک قوم کا غلبہ انہیں ناگوار تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایک نبی کی آمد سے پہلے جو لوگ سابق نبی کو مانتے ہوں وہ اصولاً مسلمان ہی کی تعریف میں آتے ہیں اور جب تک بعد کے آنے والے نبی کی دعوت انہیں نہ پہنچے اور وہ اس کا انکار نہ کردیں، ان کا شمار مسلمانوں ہی میں رہتا ہے۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر صرف پانچ چھ برس ہی گزرے تھے، اور حضورؐ کی دعوت ابھی تک باہر نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے مسلمان عیسائیوں کا شمار کافروں میں نہیں کرتے تھے۔ البتہ یہودی ان کی نگاہ میں کافر تھے، کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کرچکے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ آغازِ اسلام میں عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی ہی کا برتاؤ ہوا تھا جیسا کہ سورۂ قصص رکوع ۶، اور سورۂ مائدہ رکوع ۱۱ میں بیان ہوا ہے، بلکہ ان میں سے بہت سے لوگ کھلے دل سے دعوتِ حق کو قبول کر رہے تھے۔ پھر ہجرتِ حبشہ کے موقع پر جس طرح حبش کے عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کی واپسی کے لیے کفارِ مکہ کے مطالبے کو ٹھکرا دیا اس کا بھی یہ تقاضا تھا کہ مسلمان مجوسیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کے خیرخواہ ہوں۔

۲ یعنی پہلے جب ایرانی غالب آئے تو اس بنا پر نہیں کہ معاذ اللہ خداوندِ عالم ان کے مقابلے میں شکست کھا گیا، اور بعد میں جب رومی فتحیاب ہوں گے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا کھویا ہوا ملک مل جانے گا۔ فرمانروائی تو ہر حال میں اللہ ہی کی ہے۔ پہلے جسے فتح نصیب ہوئی اسے بھی اللہ ہی نے فتح دی، اور بعد میں جو فتح پائے گا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے پائے گا۔ اس کی خدائی میں کوئی اپنے زور سے غلبہ حاصل نہیں کرسکتا۔ جسے وہ اٹھاتا ہے وہی اٹھتا ہے اور جسے وہ گراتا ہے وہی گرتا ہے۔

۳ ابن عباسؓ، ابو سعید خدریؓ، سفیان ثوریؒ، سُدّی وغیرہ حضرات کا بیان ہے کہ ایرانیوں

ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ؔ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور

پر رومیوں کی فتح اور جنگ بدر میں مشرکین پر مسلمانوں کی فتح کا زمانہ ایک ہی تھا، اس لیے مسلمانوں کو دہری خوشی حاصل ہوئی۔ یہی بات ایران اور روم کی تاریخوں سے بھی ثابت ہے۔ سنہ ۶۲۴ء ہی وہ سال ہے جس میں جنگ بدر ہوئی، اور یہی وہ سال ہے جس میں قیصر روم نے زرتشت کا مولد تباہ کیا اور ایران کے سب سے بڑے آتشکدے کو مسمار کر دیا۔

؎ یعنی اگرچہ آخرت پر دلالت کرنے والے آثار و شواہد کثرت سے موجود ہیں اور اس سے غفلت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لیکن یہ لوگ اس سے خود ہی غفلت برت رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے کہ دنیوی زندگی کے اس ظاہری پردے پر نگاہ جما کر بیٹھ گئے ہیں اور اس کے پیچھے جو کچھ آنے والا ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں، ورنہ خدا کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔

؎ یہ آخرت پر بجائے خود ایک مستقل استدلال ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ لوگ باہر کسی طرف نگاہ دوڑانے سے پہلے خود اپنے وجود پر غور کرتے تو انہیں اپنے اندر ہی وہ دلائل مل جاتے جو موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی کی ضرورت ثابت کرتے ہیں۔ انسان کی تین امتیازی خصوصیات ایسی ہیں جو اس کو زمین کی دوسری موجودات سے ممیز کرتی ہیں:

ایک یہ کہ زمین اور اس کے ماحول کی بے شمار چیزیں اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہیں اور ان پر تصرف کے وسیع اختیارات اس کو بخش دیئے گئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اسے اپنی راہ زندگی کے انتخاب میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایمان اور کفر، طاعت اور معصیت، نیکی اور بدی کی راہوں میں سے جس راہ پر بھی جانا چاہے جا سکتا ہے۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط، جس طریقے کو بھی اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ ہر راستے پر چلنے کے لیے اسے توفیق دے دی جاتی ہے اور اس پر چلنے میں وہ خدا کے فراہم کردہ ذرائع استعمال کر سکتا ہے، خواہ وہ خدا کی اطاعت کا راستہ ہو یا اس کی نافرمانی کا راستہ۔

ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مقرر مدت ہی کے لیے پیدا کیا ہے[۶]

تیسرے یہ کہ اس میں پیدائشی طور پر اخلاق کی حس رکھ دی گئی ہے جس کی بنا پر وہ اختیاری اعمال میں فرق کرتا ہے، اختیاری اعمال میں نیکی اور بدی کا حکم لگاتا ہے، اور بداہتہً یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اچھا عمل جزاء کا اور بُرا عمل سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔

یہ تینوں خصوصیتیں جو انسان کے اپنے وجود میں پائی جاتی ہیں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ کوئی وقت ایسا ہونا چاہیے جب انسان سے محاسبہ کیا جائے جب اس سے پوچھا جائے کہ جو کچھ دنیا میں اس کو دیا گیا تھا اس پر تصرف کے اختیارات کو اس نے کس طرح استعمال کیا۔ جب یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنی آزادئ انتخاب کو استعمال کر کے صحیح راستہ اختیار کیا یا غلط۔ جب اس کے اختیاری اعمال کی جانچ کی جائے اور نیک عمل پر جزا اور بُرے عمل پر سزا دی جائے۔ یہ وقت لامحالہ انسان کا کارنامۂ زندگی ختم اور اس کا دفترِ عمل بند ہونے کے بعد ہی آسکتا ہے نہ کہ اس سے پہلے۔ اور یہ وقت لازماً اسی وقت آنا چاہیے جبکہ ایک فرد یا ایک قوم کا نہیں بلکہ تمام انسانوں کا دفترِ عمل بند ہو۔ کیونکہ ایک فرد یا ایک قوم کے مرجانے پر اُن اثرات کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا جو اس نے اپنے اعمال کی بدولت دنیا میں چھوڑے ہیں۔ اُس کے چھوڑے ہوئے اچھے یا بُرے اثرات بھی تو اس کے حساب میں شمار ہونے چاہییں۔ یہ اثرات جب تک مکمل طور پر ظاہر نہ ہو لیں انصاف کے مطابق پورا محاسبہ کرنا اور پوری جزا یا سزا دینا کیسے ممکن ہے۔ اس طرح انسان کا اپنا وجود اس بات کی شہادت دیتا ہے، اور زمین میں انسان کو جو حیثیت حاصل ہے وہ آپ سے آپ اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ دنیا کی موجودہ زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں عدالت قائم ہو اور انصاف کے ساتھ انسان کے کارنامۂ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اور ہر شخص کو اس کے کام کے لحاظ سے جزا دی جائے۔

[۶] اس فقرے میں آخرت کی دو مزید دلیلیں دی گئی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظام کائنات کو بنظرِ غور دیکھے تو اسے دو حقیقتیں نمایاں نظر آئیں گی:۔

ایک یہ کہ یہ کائنات برحق بنائی گئی ہے۔ یہ کسی بچّے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے اس نے ایک بے ڈھنگا سا گھروندا بنا لیا ہو جس کی تعمیر اور تخریب دونوں ہی بے معنی ہوں۔ بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے، جس کا ایک ایک ذرّہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے، جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، جس کی ہر شے بامقصد ہے۔ انسان کا سارا تمدن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم و فنون خود اس بات پر گواہ ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والے قوانین کو دریافت کر کے اور ہر شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اسے تلاش کر کے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کر سکا ہے، ورنہ ایک بے ضابطہ اور بے مقصد کھلونے میں اگر ایک پتلے کی حیثیت سے اس کو رکھ دیا گیا ہوتا تو کسی سائنس اور کسی تہذیب و تمدن کا تصوّر تک نہ کیا جا سکتا تھا۔ اب آخر یہ بات تمہاری عقل میں کیسے سماتی ہے کہ جس حکیم نے اِس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے اور اس کے اندر تم جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجہ کی ذہنی و جسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات دے کر، آزادیٔ انتخاب دے کر، اخلاق کی حس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سروسامان تمہارے حوالہ کیا ہے، اس نے تمہیں بے مقصد ہی پیدا کر دیا ہوگا؟ تم دنیا میں تعمیر و تخریب اور نیکی و بدی، اور ظلم و عدل، اور راستی و ناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مر کر مٹی میں مل جاؤ گے اور تمہارے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا؟ تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیاء پر بہت سے مفید یا مضر اثرات ڈال کر چلے جاؤ گے اور تمہارے مرتے ہی یہ سارا دفترِ عمل بس یونہی لپیٹ کر دریا بُرد کر دیا جائے گا؟

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لیے بھی ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی معاملہ بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں۔ ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں، اور کسی وقت پر انہیں

مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ اور کیا یہ لوگ کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ انہیں اُن لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ ان سے زیادہ

لامحالہ خرچ ہو جاتا اور اس نظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث اُن فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالم کے حدوث و قِدَم کی اُس بحث میں، جو ایک مدتِ دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا وزن خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لیے عقل اور حکمت کا نام لیکر یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیل پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا، صرف صورت بدلی جا سکتی ہے، مگر ہر تغیر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کوئی کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالمِ مادی کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ لیکن اب جوہری توانائی (ATOMIC ENERGY) کے انکشاف نے اس پورے تخیل کی بساط اُلٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوت مادے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادہ پھر قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیولیٰ۔ اب عرکیاتِ حرارت کے دوسرے قانون (SECOND LAW OF THERMO-DYNAMICS) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالمِ مادی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیے۔ اس لیے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اُٹھ کر قیامت کا انکار کریگا۔

ۓ یعنی اس بات کے منکر کہ انہیں مرنے کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

ۓ یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت کا انکار دنیا میں دو چار آدمیوں ہی نے تو نہیں کیا ہے۔ انسانی تاریخ کے دوران میں کثیر التعداد انسان اس مرض میں مبتلا ہوتے رہے ہیں بلکہ پوری پوری قومیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے یا تو اس کا انکار کیا ہے، یا

طاقت رکھتے تھے، انہوں نے زمین کو خوب اُدھیڑا تھا۹ اور اُسے اُتنا آباد کیا تھا جتنا اِنہوں نے نہیں کیا ہے۔۱۰ اُن کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لیکر آتے۱۱ پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا

اس سے غافل ہو کر رہی ہیں، یا حیات بعد الموت کے متعلق ایسے غلط عقیدے ایجاد کر لیے ہیں جن سے آخرت کا عقیدہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر تاریخ کا مسلسل تجربہ یہ بتاتا ہے کہ انکارِ آخرت جس صورت میں بھی کیا گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اخلاق بگڑے، وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر شتر بے مہار بن گئے، انہوں نے ظلم و فساد اور فسق و فجور کی حد کر دی، اور اسی چیز کی بدولت قوموں پر قومیں تباہ ہوتی چلی گئیں۔ کیا ہزاروں سال کی تاریخ کا یہ تجربہ، جو پے در پے انسانی نسلوں کو پیش آتا رہا ہے، یہ ثابت نہیں کرتا کہ آخرت ایک حقیقت ہے جس کا انکار انسان کے لیے تباہ کن ہے؟ انسان کششِ ثقل کا اسی لیے تو قائل ہوا ہے کہ تجربے اور مشاہدے سے اس نے مادی اشیا کو ہمیشہ زمین کی طرف گرتے دیکھا ہے۔ انسان نے زہر کو زہر اسی لیے تو مانا ہے کہ جس نے بھی زہر کھایا وہ ہلاک ہوا۔ اسی طرح جب انکارِ آخرت ہمیشہ انسان کے لیے اخلاقی بگاڑ کا موجب ثابت ہوا ہے تو کیا یہ تجربہ یہ سبق دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ حقیقت کے خلاف ہے اور اصل حقیقت اس کے برعکس ہے؟

۹؎ اصل میں لفظ اَثَارُوا الْاَرْضَ استعمال ہوا ہے۔ اس کا اطلاق زراعت کے لیے ہل چلانے پر بھی ہو سکتا ہے اور زمین کھود کر زیرِ زمین پانی، نہریں، کاریزیں اور معدنیات وغیرہ نکالنے پر بھی۔

۱۰؎ اس میں ان لوگوں کے استدلال کا جواب موجود ہے جو محض مادی ترقی کو کسی قوم کے صالح ہونے کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے زمین کے ذرائع کو اتنے بڑے پیمانے پر استعمال (EXPLOIT) کیا ہے، جنہوں نے دنیا میں عظیم الشان تعمیری کام کیے ہیں اور ایک شاندار تمدن کو جنم دیا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کا ایندھن بنا دے۔ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ "تعمیری کام" پہلے بھی [illegible] قوموں نے بڑے پیمانے پر کیے ہیں، پھر کیا تمہاری آنکھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ قومیں اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سمیت پیوندِ خاک ہو گئیں اور ان کی "تعمیر" کا قصرِ فلک بوس زمین پر آ رہا؟ جس خدا کے قانون نے یہاں عقیدۂ حق اور اخلاقِ صالحہ کے بغیر محض مادی تعمیر کی یہ

نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے[۱۲] آخر کار جن لوگوں نے برائیاں کی تھیں ان کا انجام بہت بُرا ہوا، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے ؏ ع

قدر کی ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اسی خدا کا قانون دوسرے جہان میں انہیں واصلِ جہنم نہ کرے۔

[۱۱] یعنی ایسی نشانیاں لیکر آتے جو ان کے نبی صادق ہونے کا یقین دلانے کے لیے کافی تھیں۔ اس سیاق و سباق میں انبیاء کی آمد کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف انسان کے اپنے وجود میں، اور اس سے باہر ساری کائنات کے نظام میں، اور انسانی تاریخ کے مسلسل تجربے میں آخرت کی شہادتیں موجود تھیں، اور دوسری طرف پے درپے ایسے انبیاء بھی آئے جن کے ساتھ ان کی نبوت کے برحق ہونے کی کھلی کھلی علامتیں پائی جاتی تھیں، اور انہوں نے انسانوں کو خبردار کیا کہ فی الواقع آخرت آنے والی ہے۔

[۱۲] یعنی اس کے بعد جو تباہی ان قوموں پر آئی وہ ان پر خدا کا ظلم نہ تھا بلکہ وہ ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے اپنے اوپر کیا۔

منصبِ نبوّت

صحیح اور غلط تصوّر کا فرق

(۲)

۵ - مرکزِ ملّت؟ پانچواں نکتہ آپ یہ ارشاد فرماتے ہیں :

"چونکہ دین کا تقاضا یہ تھا کہ کتاب پر عمل اجتماعی شکل میں ہو، اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص قرآن پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرے اور دوسرا اپنی سمجھ کے مطابق، اس لیے نظام کو قائم رکھنے کے لیے ایک زندہ شخصیت کی ضرورت ہے۔ اور مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ جہاں اجتماعی نظام کے قیام کا سوال ہو وہاں پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے، کیونکہ پیغام اس نے اس لیے پہنچایا کہ وحی اس کے سوا کسی اور کو نہیں ملتی۔ چنانچہ قرآن نے اسی لیے واضح کر دیا کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ چنانچہ حضور مرکزِ ملّت بھی تھے۔ اور سنت رسول اللہ پر عمل یہی ہے کہ حضور کے بعد بھی اسی طرح مرکزیت کو قائم رکھا جاتے، چنانچہ اسی نکتہ کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ وَمَا مُحَمَّدًا اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلِ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ[1] (۳:۱۴۴)"

اس نکتہ کو آپ نے اچھی طرح کھول کر بیان نہیں فرمایا ہے۔ آپ کے مجموعی ارشادات کی مدد سے آپ کا جو مدعا سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض اجتماعی نظام قائم کرنے کی خاطر اپنے زمانے میں رسول کے علاوہ "مرکزِ ملّت" بھی بنائے گئے تھے۔ آپ کی

[1] یہاں بھی آیت نقل کرنے میں غلطیاں کی گئی ہیں۔ وَمَا مُحَمَّدًا نہیں بلکہ وَمَا مُحَمَّدٌ ہے۔ اور من قبلہ الرسلِ نہیں بلکہ من قبلہ الرسلُ ہے۔

رسول ہونے کی حیثیت تو دائمی تھی، مگر "مرکزِ ملت" ہونے کی حیثیت صرف اس وقت تک تھی جب تک آپؐ کی زندہ شخصیت نظامِ جماعت چلا رہی تھی۔ پھر جب آپ کی وفات ہو گئی تو آپؐ کے بعد جس زندہ شخصیت کو نظام قائم رکھنے کے لیے سربراہ بنایا گیا اور اب بنایا جائے وہ اپنے زمانے کے لیے ویسا ہی "مرکزِ ملت" تھا اور ہو گا جیسے حضورؐ اپنے زمانے کے لیے تھے۔ اب سنتِ رسولؐ کی پیروی بس یہی ہے کہ ہم نظام قائم رکھنے کے لیے یکے بعد دیگرے تسلسل کے ساتھ "مرکزِ ملت" قائم کرتے رہیں۔ اس معاملہ میں بعد کے مرکز ان ملت پر اگر حضورؐ کو کوئی فوقیت ہے تو صرف یہ کہ قرآن پہنچانے والے کی حیثیت سے آپؐ کا مقام بہت آگے ہے۔

چند اصولی سوالات آپ کے کلام کی یہ تفسیر جو میں نے کی ہے یہ اگر صحیح نہیں ہے تو آپ تصحیح فرما دیں۔ صاحبِ کلام ہونے کی حیثیت سے آپ کی اپنی تفسیر صحیح تر ہو گی۔ لیکن اگر میں نے آپ کا مطلب ٹھیک سمجھا ہے تو اس پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ "مرکزِ ملت" سے آپ کی مراد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ رسالت کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی کتاب پہنچانے والے ہیں، اس کتاب کی تشریح و توضیح کرنے والے ہیں، اس کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھانے والے ہیں، افراد اور جماعت کا تزکیہ کرنے والے ہیں، مسلمانوں کے لیے نمونۂ تقلید ہیں، وہ رہنما ہیں جس کی پیروی خدا کے حکم سے واجب ہے، امر و نہی اور تحلیل و تحریم کے اختیارات رکھنے والے شارع (LAW-GIVER) ہیں، قاضی ہیں، اور حاکمِ مُطاع ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ تمام مناصب حضورؐ کو رسول ہونے کی حیثیت سے حاصل تھے اور منصبِ رسالت پر آپؐ کے مامور ہونے کا مطلب ہی یہ تھا کہ آپ ان سب مناصب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے گئے۔ اس باب میں قرآن کے واضح ارشادات میں پہلے نقل کر چکا ہوں جنہیں دہرانے کی حاجت نہیں۔ اب چونکہ "مرکزِ ملت" قرآن کی نہیں بلکہ

آپ لوگوں کی اپنی بنائی ہوئی اصطلاح ہے، اس لیے براہِ کرم آپ یہ بتائیں کہ "مرکزِ ملت" کا منصب اِن مناصب کے ماسوا کچھ ہے؟ یا انہی مناصب کا مجموعہ ہے؟ یا ان میں سے بعض مناصب اس میں شامل ہیں اور بعض نہیں ہیں؟ اگر وہ ان کے ماسوا کچھ ہے تو وہ کیا ہے اور حضورؐ کے اُس منصب کا علم آپ کو کس ذریعہ سے حاصل ہوا ہے؟ اگر وہ انہی مناصب کا مجموعہ ہے تو آپ اس کو رسالت سے الگ کیسے قرار دیتے ہیں؟ اور اگر ان میں سے بعض مناصب "مرکزِ ملت" کے ہیں اور بعض منصبِ رسالت کے تو وہ کون کون سے مناصب ہیں جو مرکزِ ملت کے منصب میں شامل ہیں اور ان کو کس دلیل سے آپ منصبِ رسالت سے الگ کرتے ہیں؟

دوسرا سوال "مرکزِ ملت" کے تقرر کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تقرر کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے مرکزِ ملت مقرر کرے۔ دوسری یہ کہ مسلمان اپنی مرضی سے اس کو منتخب کریں۔ تیسری یہ کہ وہ طاقت سے مسلط ہو کر زبردستی مرکزِ ملت بن جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ "مرکزِ ملت" سے خواہ کچھ بھی مراد ہو، اس منصب پر حضورؐ کا تقرر اِن تینوں صورتوں میں سے کس صورت پر ہُوا تھا؟ کیا یہ تقرر اللہ نے کیا تھا؟ یا مسلمانوں نے آپ کو اس منصب کے لیے منتخب کیا تھا؟ یا حضورؐ خود "مرکزِ ملت" بن گئے تھے؟ ان میں سے جو شق بھی آپ اختیار کرتے ہیں اس کی تصریح ہونی چاہیے۔ اور اسی طرح یہ تصریح بھی ہونی چاہیے کہ حضورؐ کے بعد جو بھی "مرکزِ ملت" بنے گا وہ خداوندِ عالم کی طرف سے نامزد اور مامور کیا ہُوا ہوگا؟ یا مسلمان اس کو مرکز بنائیں گے؟ یا وہ خود اپنے زور سے مرکز بن جائے گا؟ اگر دونوں کے طریقِ تقرر میں آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے تو صاف صاف یہ بات کہہ دیجیے تاکہ آپ کا موقف مبہم نہ رہے۔ اور اگر فرق ہے تو بتائیے کہ وہ کیا فرق ہے اور اس فرق سے دونوں قسم کے مرکزوں کی حیثیت میں بھی کوئی بنیادی فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ "پہنچانے والے کا مقام بہت آگے ہوتا ہے" فرما کر آپ نے

از راہِ کرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے "مرکزانِ ملت" پر جو فوقیت عطا فرمائی ہے یہ محض درجے اور مرتبے کی فوقیت ہے یا آپ کے نزدیک دونوں کے منصبوں کی نوعیت میں بھی کوئی فرق ہے؟ زیادہ واضح الفاظ میں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا آپ کے خیال میں وہ سب اختیارات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مرکزِ ملت" کی حیثیت سے حاصل تھے، آپ کے بعد "مرکزِ ملت" بننے والے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں؟ اور باعتبارِ اختیارات دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور حضور کی فوقیت بس اتنی ہے کہ آپ بعد والے مرکز کی بہ نسبت کچھ زیادہ احترام کے مستحق ہیں کیونکہ آپ نے قرآن پہنچایا ہے؟ اگر یہ آپ کا خیال ہے تو بتائیے کہ حضور کے بعد بننے والے یا بنائے جانے والے مرکز کی حیثیت بھی کیا یہی ہے کہ اس کے فیصلے سے سرتابی کرنا تو درکنار، اس کے خلاف دل میں تنگی محسوس کرنے سے بھی آدمی کا ایمان سلب ہو جاتا ہے؟ کیا اس کی حیثیت بھی یہی ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں اپنا فیصلہ دے دے تو مسلمانوں کو اس سے مختلف کوئی رائے رکھنے تک کا حق باقی نہ رہے؟ کیا اس کا مقام بھی یہی ہے کہ اس کے ساتھ مسلمان کوئی نزاع نہیں کر سکتے اور اس کے فرمان کو بے چون و چرا تسلیم کر لینے کے سوا امت کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے اگر وہ مومن رہنا چاہتی ہو؟ کیا وہ زندہ شخصیت یا شخصیتیں جو "مرکزِ ملت" بنیں یا بنائی جائیں، اسوۂ حسنہ بھی ہیں کہ مسلمان ان کی زندگیوں کو دیکھیں اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں؟ کیا وہ بھی ہمارے تزکیے اور تعلیمِ کتاب و حکمت اور تشریح ما انزل اللہ کے لیے "مبعوث" ہوئے ہیں کہ مستند ہو ان کا فرمایا ہوا؟

کیا ہی اچھا ہو کہ آپ ان سوالات پر ذرا تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں تاکہ اس "مرکزِ ملت" کی ٹھیک ٹھیک پوزیشن سب کے سامنے آجائے جس کا ہم بہت دنوں سے چرچا سن رہے ہیں۔

۶۔ کیا حضور صرف قرآن پہنچانے کی حد تک نبی تھے؟ آپ کا چھٹا نکتہ آپ کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

"آپ کا اگلا سوال یہ ہے کہ جو کام حضور نے تئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں سرانجام دیئے

ان میں آنحضرت کی پوزیشن کیا تھی؟ میرا جواب یہ ہے کہ حضور نے جو کچھ کر کے دکھایا وہ ایک بشر کی حیثیت سے لیکن ما انزل اللہ کے مطابق کر کے دکھایا۔ میرا یہ جواب کہ حضور کے فرائض رسالت کی سرانجام دہی ایک بشر کی حیثیت سے تھی میرے اپنے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ خود کتاب اللہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حضور نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔"

اس عبارت میں آپ نے میرے جس سوال کا جواب دیا ہے وہ دراصل یہ تھا کہ اس پیغمبرانہ زندگی میں حضورؐ نے قرآن پہنچانے کے سوا دوسرے جو کام کیے تھے وہ آیا نبی ہونے کی حیثیت میں کیے تھے جن میں آپ قرآن مجید کی طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرتے تھے، یا ان کاموں میں آپ کی حیثیت محض ایک عام مسلمان کی سی تھی؟ اس کا جواب آپ یہ دیتے ہیں کہ یہ کام حضورؐ نے بشر کی حیثیت سے کیے تھے لیکن ما انزل اللہ کے مطابق کیے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف قرآن پہنچا دینے کی حد تک نبی تھے، اس کے بعد ایک قائد و رہنما، ایک معلم، ایک مربّی، ایک مقنّن، ایک جج اور ایک فرمانروا ہونے کی حیثیت میں آپؐ نے جو کچھ بھی کیا اس میں آپؐ کا مقام ایک نبی کا نہیں بلکہ ایک ایسے عام انسان کا تھا جو قرآن کے مطابق عمل کرتا ہو۔ آپ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن نے حضورؐ کی یہی حیثیت بیان کی ہے لیکن اس سے پہلے قرآن کی جو صریح آیات میں نے نقل کی ہیں ان کو پڑھنے کے بعد کوئی ذی فہم آدمی یہ نہیں مان سکتا کہ قرآن نے واقعی حضورؐ کو یہ حیثیت دی ہے۔

آپ قرآن سے یہ ادھوری بات نقل کر رہے ہیں کہ حضور بار بار اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ فرماتے تھے۔ پوری بات جو قرآن نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے بشر ہیں جسے رسول بنایا گیا ہے۔ (قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا) اور حضورؐ ایک ایسے بشر ہیں جس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہے (قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ)۔ کیا آپ ایک عام بشر اور رسالت و وحی پانے والے بشر کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں سمجھتے؟ جو بشر خدا کا رسول ہو وہ تو لامحالہ خدا کا نمائندہ

ہے، اور جس بشر کے پاس وحی آتی ہو وہ خدا کی براہِ راست ہدایت کے تحت کام کرتا ہے۔ اس کی حیثیت اور ایک عام بشر کی حیثیت یکساں کیسے ہو سکتی ہے۔

آپ جب یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ ما انزل اللہ کے مطابق کام کرتے تھے تو آپ کا مطلب ما انزل اللہ سے صرف قرآن ہوتا ہے۔ اس لیے آپ لفظاً ایک حق بات مگر معنیً ایک باطل بات کہتے ہیں۔ بلاشبہ حضورؐ ما انزل اللہ کے مطابق کام کرتے تھے، مگر آپ کے اوپر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں پائی جاتی ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی آپ کو وحی کے ذریعہ سے احکام ملتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت میں آپ کے 'چوتھے نکتے کا جواب دیتے ہوئے پیش کر چکا ہوں۔ مزید ثبوت انشاء اللہ آپ کے دسویں نکتے کی بحث میں دوں گا۔

۷۔ حضور کی اجتہادی لغزشوں سے غلط استدلال | ساتواں نکتہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا ہے:

"قرآن کی آیات سے واضح ہے کہ حضور نظامِ مملکت کی سرانجام دہی میں ایک بشر کی حیثیت رکھتے تھے اور کبھی کبھی آنحضرت سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحٰی[1] اِلَیَّ رَبِّیْ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ (ر ۳۰/۵)[2]۔ اگر یہ اجتہادی غلطیاں ایسی ہوتیں جن کا اثر دین کے اہم گوشے پر پڑتا تو خدا کی طرف سے اس کی تادیب بھی آجاتی جیسے کہ ایک جنگ کے موقع پر بعض لوگوں نے پیچھے رہنے کی اجازت چاہی اور حضورؐ نے دیدی۔ اس پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ اِمَا اَذِنْتَ[3] لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (۹/۴۳)۔ اسی طرح سورہ تحریم میں تادیب آگئی یاایھا النَّبِیُّ[4] لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (۶۶/۸۱) اسی طرح سورہ عبس میں ہے عَبَسَ وَ

---

[1] صحیح لفظ یُوْحِیْ ہے نہ کہ یُوْحیٰ

[2] حوالہ غلط ہے۔ یہ سورہ روم کی نہیں بلکہ سورہ سبا کی آیت ہے۔

[3] یہ الفاظ بھی غلط نقل کیے گئے ہیں۔ صحیح لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ہے۔

[4] صحیح لفظ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ ہے نہ کہ یا ایھا النبی۔

تَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرُ ۱؎
اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَتَزَکّٰی ۲؎ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ
یَسْعٰی وَهُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی (۸۰: ۱-۱۰)۔

یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوتا ہے کہ کس قدر سرسری مطالعہ کی بنا پر لوگ کتنے بڑے اور نازک مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک رسول بھی بھیجا اور پھر خود ہی اس کا اعتبار کھونے اور اسے غلط کار و گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ آیات بھی قرآن میں نازل کر دیں تاکہ کہیں لوگ اطمینان کے ساتھ اس کی پیروی نہ کرنے لگیں؟ کاش آپ نے قرآن کا آپریشن کرنے سے پہلے ان آیات پر اتنا ہی غور کر لیا ہوتا جتنا کسی مریض کی ایکس رے رپورٹ پر غور کرتے ہیں۔

پہلی آیت قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ سے آپ یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ خود قرآن کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی گمراہ بھی ہو جاتے تھے اور آپ کی زندگی در اصل ضلالت و ہدایت کا مجموعہ تھی (معاذ اللہ)۔ یہ استدلال کرتے وقت آپ نے کچھ نہ دیکھا کہ یہ آیت کس سیاق و سباق میں آئی ہے۔ سورۂ سبا میں اللہ تعالیٰ پہلے کفارِ مکہ کا یہ الزام نقل فرماتا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ (آیت ۸) "یہ شخص یا تو اللہ پر جان بوجھ کر بہتان گھڑتا ہے، یا یہ مجنون ہے"۔ پھر اس کا جواب دیتے ہوئے آیات ۴۶ تا ۵۰ میں الزام نمبر ۲ کے متعلق فرماتا ہے کہ تم لوگ فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ کر خالصۃً للہ غور کرو، تمہارا دل خود گواہی دیگا کہ یہ شخص جو تمہیں اسلام کی تعلیم دے رہا ہے اس میں جنون کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد پہلے الزام افتراء علی اللہ کے جواب میں اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ اے نبیؐ ان سے کہو، اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ، درحقیقت یہ سچا کلام میرا رب

۱؎ پورا فقرہ غلط نقل کیا گیا ہے۔ صحیح یہ ہے لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰٓی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی

۲؎ قرآن میں یَزَّکّٰی ہے نہ کہ یَتَزَکّٰی۔

الفاظ فرما رہا ہے۔ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ۔ اگر میں گمراہ ہو گیا ہوں (جیسا کہ تم الزام لگا رہے ہو) تو میری اس گمراہی کا وبال مجھ پر ہے۔ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْٓ اِلَیَّ رَبِّیْ۔ اور اگر میں راہ راست پر ہوں تو اس وحی کی بنا پر ہوں جو میرا رب مجھ پر نازل کرتا ہے۔ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ۔ وہ سب کچھ سننے والا اور قریب ہے یعنی اس سے پوشیدہ نہیں ہے کہ میں گمراہ ہوں یا خدا کی طرف سے ہدایت یافتہ۔ اس سیاق و سباق میں جو بات کہی گئی ہے اس کا آپ یہ مطلب لے رہے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کے سامنے اپنے رسول سے یہ اعتراف کروا دیا کہ واقعی میں کبھی گمراہ بھی ہو جاتا ہوں، مگر کبھی سیدھے راستے پر بھی چل لیتا ہوں۔ سبحان اللہ، کیا خوب قرآن فہمی ہے۔

دوسری آیات جو آپ نے پیش فرمائی ہیں ان سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فیصلوں میں بہت سی غلطیاں کی تھیں جن میں سے اللہ میاں نے بطور نمونہ یہ دو چار غلطیاں پکڑ کر بتا دیں تاکہ لوگ ہوشیار ہو جائیں۔ حالانکہ دراصل ان سے نتیجہ بالکل برعکس نکلتا ہے۔ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور سے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں بس وہی چند لغزشیں ہوئی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے فوراً اصلاح فرما دی، اور اب ہم پورے اطمینان کے ساتھ اُس پوری سنت کی پیروی کر سکتے ہیں جو آپ سے ثابت ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی اور لغزش ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی برقرار نہ رہنے دیتا جس طرح اِن لغزشوں کو اس نے برقرار نہیں رہنے دیا۔

پھر آپ نے کچھ تو سوچا ہوتا کہ وہ لغزشیں ہیں کیا جن پر اللہ نے ان آیات میں اپنے نبی کو ٹوکا ہے۔ جنگ میں فوجی خدمت سے استثناء کی درخواست پر کسی کو مستثنیٰ کر دینا، کسی حلال چیز کو نہ کھانے کا عہد کر لینا، ایک صحبت میں چند اہم شخصیتوں کو دین کی دعوت دیتے ہوئے بظاہر ایک غیر اہم شخصیت کی طرف توجہ نہ کرنا، کیا یہ ایسے ہی بڑے معاملات ہیں جن کا دین کے اہم گوشوں پر اثر پڑتا ہے؟ کونسا ایسا لیڈر، یا فرمانروا، یا آپ کی اصطلاحِ خاص میں "مرکزِ ملت" ہے

جس کی زندگی میں بارہا اس طرح کے، بلکہ اس سے بہت زیادہ بڑے معاملات نہ پیش آتے ہوں؟ پھر کیا ان لغزشوں کی تصحیح کے لیے ہمیشہ آسمان ہی سے وحی اترا کرتی ہے؟ آخر وہ کیا خاص وجہ ہے کہ اتنی معمولی لغزشیں جب رسول پاکؐ سے صادر ہوئیں تو فوراً ان کی اصلاح کے لیے وحی آگئی اور اسے کتاب میں ثبت کر دیا گیا؟ آپ اس معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ رسالت کے منصب کو سمجھنے میں آپ نے کتنی بڑی ٹھوکر کھائی ہے۔ کوئی رئیس، یا لیڈر، یا مرکزِ ملت اللہ تعالیٰ کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ اس کا مقرر کیا ہوا شارع (LAW-GIVER) اور اس کا مامور کیا ہوا نمونۂ تقلید نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کی کوئی بڑی سے بڑی غلطی بھی قانونِ اسلامی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس سے خدا کی شریعت کے اصول نہیں بدل سکتے۔ لیکن رسول پاک چونکہ خدا کے اپنے اعلان کی رُو سے دنیا کے سامنے مرضاتِ الٰہی کی نمائندگی کرتے تھے اور خدا نے خود اہلِ ایمان کو حکم دیا تھا کہ تم ان کی اطاعت اور ان کا اتباع کرو، جو کچھ یہ حلال کہیں اسے حلال مانو اور جو کچھ یہ حرام قرار دے دیں اسے حرام مان لو، اس لیے ان کے قول و عمل میں یہ چھوٹی لغزشیں بھی بہت بڑی تھیں، کیونکہ وہ ایک معمولی بشر کی لغزشیں نہ تھیں، بلکہ اُس شارعِ مجاز کی لغزشیں تھیں جس کی ایک ایک حرکت اور سکون سے قانون بن رہا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمہ لی تھی کہ اپنے رسول کو ٹھیک راستے پر قائم رکھے گا، ان کو غلطیوں سے محفوظ کر دیگا، اور ان سے ذرا سی چوک بھی ہو جائے تو وحی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرما دیگا۔

۸۔ موہوم خطرات | آٹھویں نکتے میں آپ فرماتے ہیں کہ اگر حضورؐ نے یہ سارا کام بشر (یعنی ایک عام غیر معصوم بشر) کی حیثیت سے نہیں بلکہ نبی کی حیثیت سے کیا ہوتا تو اس سے لازماً دو نتائج پیدا ہوتے۔ ایک یہ کہ حضورؐ کے بعد اس کام کو جاری رکھنا غیر ممکن تصور کیا جاتا اور لوگ یہ سمجھتے کہ جو نظامِ زندگی حضورؐ نے قائم کر کے چلا دیا اسے قائم کرنا اور چلانا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اس کام کو چلانے کے لیے لوگ حضورؐ کے بعد

بھی نبیوں کے آنے کی ضرورت محسوس کرتے۔ ان دونوں خطرات سے بچنے کی واحد صورت آپ کے نزدیک یہ ہے کہ تبلیغِ قرآن کے ماسوا حضورؐ کے باقی پورے کارنامہ زندگی کو رسول اللہ کا نہیں بلکہ ایک غیر نبی انسان کا کارنامہ مانا جائے۔ اسی سلسلے میں آپ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے رسول کا کارنامہ سمجھنا ختم نبوت کے عقیدے کی بھی نفی کرتا ہے، کیونکہ اگر حضورؐ نے یہ سارا کام وحی کی رہنمائی میں کیا ہے تو پھر ویسا ہی کام کرنے کے لیے ہمیشہ وحی آنے کی ضرورت رہے گی، ورنہ دین قائم نہ ہوگا۔

یہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، قرآن اور اس کے نزول کی تاریخ سے آنکھیں بند کرکے اپنے ہی مفروضات کی دنیا میں گھوم پھر کر سوچا اور فرما دیا ہے۔ آپ کی ان باتوں سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ آپ کی نگاہ سے قرآن کی بس وہی آیتیں گزری ہیں جو مخالفینِ سنت نے اپنے لٹریچر میں ایک مخصوص نظریہ ثابت کرنے کے لیے نقل کی ہیں، اور انہی کو ایک خاص ترتیب سے جوڑ جاڑ کر اُن لوگوں نے جو نتائج نکال لیے ہیں ان پر آپ ایمان لے آئے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی اور آپ نے ایک مرتبہ بھی پورا قرآن سمجھ کر پڑھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ جو خطرات آپ کے نزدیک سیرتِ پاک کو سنتِ رسولؐ ماننے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں وہی سب خطرات قرآن کو وحیِ الٰہی ماننے سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن خود اس بات پر شاہد ہے کہ یہ پوری کتاب ایک ہی وقت میں بطور ایک کتابِ آئین کے نازل نہیں ہو گئی تھی بلکہ یہ اُن وحیوں کا مجموعہ ہے جو ایک تحریک کی رہنمائی کے لیے ۲۳ سال تک تحریک کے ہر مرحلے میں ہر اہم موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ایک برگزیدہ انسان اسلامی تحریک کی قیادت کے لیے مبعوث ہوا ہے اور قدم قدم پر خدا کی وحی اس کی رہنمائی کر رہی ہے۔ مخالفین اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرتے ہیں اور جواب اُن کا آسمان سے آتا ہے۔ طرح طرح کی مزاحمتیں راستے میں حائل ہوتی ہیں اور تدبیر اوپر سے بتائی جاتی ہے کہ یہ مزاحمت اس طرح

سے دور کرو اور اس مخالفت کا یوں مقابلہ کرو۔ پیرووں کو طرح طرح کی مشکلات سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کا حل اوپر سے بتایا جاتا ہے کہ تمہاری فلاں مشکل یوں دور ہو سکتی ہے اور فلاں مشکل یوں رفع ہو سکتی ہے۔ پھر یہ تحریک جب ترقی کرتے ہوئے ایک ریاست کے مرحلے میں داخل ہوتی ہے تو جدید معاشرے کی تشکیل اور ریاست کی تعمیر کے مسائل سے لیکر منافقین اور یہود اور کفار عرب سے کشمکش تک جتنے معاملات بھی دس سال کی مدت میں پیش آتے ہیں ان سب میں وحی اس معاشرے کے معمار اور اس ریاست کے فرمانروا اور اس فوج کے سپہ سالار کی رہنمائی کرتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس تعمیر اور کشمکش کے ہر مرحلے میں جو مسائل پیش آتے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے آسمان سے ہدایات آتی ہیں بلکہ کوئی جنگ پیش آتی ہے تو اس پر لوگوں کو ابھارنے کے لیے سپہ سالار کو خطبہ آسمان سے ملتا ہے۔ تحریک کے کارکن کہیں کمزوری دکھاتے ہیں تو ان کی فہمائش کے لیے تقریر آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ نبی کی بیوی پر دشمن تہمت رکھتے ہیں تو اس کی صفائی آسمان سے آتی ہے۔ منافقین مسجد ضرار بناتے ہیں تو اس کے توڑنے کا حکم وحی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جنگ پر جانے سے جی چراتے ہیں تو ان کے معاملہ کا فیصلہ براہِ راست اللہ میاں کر کے بھیجتے ہیں۔ کوئی شخص دشمن کو جاسوسی کا خط لکھ بھیجتا ہے تو اس سے نمٹنے کے لیے بھی اللہ میاں خود توجہ فرماتے ہیں۔

اگر واقعی آپ کے نزدیک یہ بات مایوس کن ہے کہ دین کو قائم کرنے کے لیے جو اولین تحریک اٹھے اس کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے ہو تو یہ مایوسی کا سبب تو خود قرآن میں موجود ہے۔ ایک شخص آپ کا نقطۂ نظر اختیار کرنے کے بعد تو کہہ سکتا ہے کہ جس دین کو قائم کرنے کے لیے جد و جہد کے پہلے قدم سے لے کر کامیابی کی آخری منزل تک ہر جزرستہ اور ہر نازک موقع پر قائد تحریک کی رہنمائی کرنے کے لیے خدا کی آیات اترتی رہی ہوں اسے اب کیسے قائم کیا جا سکتا ہے جب تک کہ اسی طرح نظام دین کے قیام کے لیے سعی و جہد کرنے والے "مرکزِ ملت" کی مدد کے لیے بھی آیاتِ الٰہی نازل ہونے کا سلسلہ نہ شروع ہو۔ اس نقطۂ نظر سے تو اللہ میاں کے لیے صحیح طریق کار

یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقرر کی پہلی تاریخ کو ایک مکمل کتابِ آئین آپ کے ہاتھ میں دے دی جاتی جس میں اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کے مسائل کے متعلق اپنی تمام ہدایات بیک وقت آپ کو دے دیتا، پھر ختمِ نبوت کا اعلان کر کے فوراً ہی حضورؐ کی اپنی نبوت بھی ختم کر دی جاتی۔ اس کے بعد یہ محمدؐ رسول اللہ کا نہیں بلکہ محمد بن عبداللہ کا کام تھا کہ غیر نبی ہونے کی حیثیت سے اس کتابِ آئین کو لے کر جدوجہد کرتے اور ما انزل اللہ کے مطابق ایک معاشرہ اور ریاست قائم کر دکھاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں کو بروقت صحیح مشورہ نہ مل سکا اور وہ ایسا نامناسب طریقہ اختیار کر گئے جو مستقبل میں قیامِ دین کے امکان سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دینے والا تھا! غضب تو یہ ہے کہ وہ اس مصلحت کو اُس وقت بھی نہ سمجھے جب انہوں نے ختمِ نبوت کا اعلان فرمایا۔ یہ اعلان سورۂ احزاب میں کیا گیا ہے جو اس زمانہ سے متصل نازل ہوئی ہے جبکہ حضرت زیدؓ نے اپنی بیوی کو طلاق دی تھی اور پھر ان کی مطلقہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکمِ الٰہی نکاح کیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد کئی سال تک حضورؐ "مرکزِ ملت" رہے اور ختمِ نبوت کا اعلان ہو جانے کے باوجود نہ حضورؐ کی نبوت ختم کی گئی اور نہ وحی کے ذریعہ سے آپ کی رہنمائی کرنے کا سلسلہ بند کیا گیا!

آپ کو اللہ میاں کی اسکیم سے اتفاق ہو یا اختلاف، بہرحال قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ان کی اسکیم ابتدا ہی سے یہ نہیں تھی کہ نوعِ انسانی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھما دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اس کو دیکھ دیکھ کر اسلامی نظامِ زندگی خود بنا لے۔ اگر یہی ان کی اسکیم ہوتی تو ایک بشر کا انتخاب کر کے چپکے سے کتاب اس کے حوالہ کرنے کی کیا ضرورت تھی! اس کے لیے تو اچھا طریقہ یہ ہوتا کہ ایک کتاب چھاپ کر اللہ میاں تمام انسانوں تک براہِ راست بھیج دیتے اور دیباچہ میں یہ ہدایت لکھ دیتے کہ میری اس کتاب کو پڑھو اور نظامِ حق برپا کر لو۔ لیکن انہوں نے یہ طریقہ پسند نہیں کیا۔ اس کے بجائے جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ایک بشر کو رسول بنا کر اٹھایا اور اس کے ذریعہ سے اصلاح و انقلاب کی ایک تحریک اٹھوائی۔

اس تحریک میں اصل عامل کتاب نہ تھی بلکہ وہ زندہ انسان تھا جسے تحریک کی قیادت پر مامور کیا گیا تھا۔ اس انسان کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی نگرانی و ہدایت میں ایک مکمل نظامِ فکر و اخلاق، نظامِ تہذیب و تمدن، نظامِ عدل و قانون اور نظامِ معیشت و سیاست، بنوا کر اور چلوا کر ہمیشہ کے لیے ایک روشن نمونہ (اسوۂ حسنہ) دنیا کے سامنے قائم کر دیا تاکہ جو انسان بھی اپنی فلاح چاہتے ہوں وہ اس نمونے کو دیکھ کر اس کے مطابق اپنا نظامِ زندگی بنانے کی کوشش کریں۔ نمونے کا ناقص رہ جانا لازماً ہدایت کے نقص کو مستلزم ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نمونے کی چیز براہِ راست اپنی ہدایات کے تحت بنوائی۔ اس کے معمار کو نقشۂ تعمیر بھی دیا اور اس کا مطلب بھی خود سمجھایا۔ اس کو تعمیر کی حکمت بھی سکھائی اور عمارت کا ایک ایک گوشہ بناتے وقت اس کی نگرانی بھی کی۔ تعمیر کے دوران میں وحی جلی کے ذریعہ سے بھی اس کو رہنمائی دی اور وحی خفی کے ذریعہ سے بھی کہیں کوئی اینٹ رکھنے میں اس سے ذرا سی چوک بھی ہو گئی تو فوراً ٹوک کر اس کی اصلاح کر دی تاکہ جس عمارت کو ہمیشہ کے لیے نمونہ بننا ہے اس میں کوئی ادنیٰ سی خامی بھی نہ رہ جائے۔ پھر جب اس معمار نے اپنے آقا کی ٹھیک ٹھیک مرضی کے مطابق یہ کارِ تعمیر پورا کر دیا تب دنیا میں اعلان کیا گیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ اس طریقِ کار نے حقیقتہً امت میں کوئی مایوسی پیدا نہیں کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب وحی الٰہی کا دروازہ بند ہو گیا تو کیا خلفائے راشدین نے پے در پے اٹھ کر وحی کے بغیر اس نمونے کی عمارت کو قائم رکھنے اور آگے اسی نمونے پر وسعت دینے کی کوشش نہیں کی؟ کیا عمر بن عبدالعزیز نے اسے انہی بنیادوں پر از سرِ نو تازہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟ کیا وقتاً فوقتاً صالح فرمانروا بھی اور مصلحینِ امت بھی اس نمونے کی پیروی کرنے کے لیے دنیا کے مختلف گوشوں میں نہیں اٹھتے رہے؟ ان میں سے آخر کس نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو وحی کی رہنمائی میں یہ کام کر گئے، اب یہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے؟ حقیقت

ہیں تو اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے تاریخِ انسانی میں اپنے رسول کے عملی کارنامے سے روشنی کا ایک مینار کھڑا کر دیا ہے جو صدیوں سے انسان کو صحیح نظامِ زندگی کا نقشہ دکھا رہا ہے اور قیامت تک دکھاتا رہے گا۔ آپ کا جی چاہے تو اس کے شکر گزار ہوں۔ اور جی چاہے تو اس کی روشنی سے آنکھیں بند کر لیں۔

۹۔ خلفائے راشدین پر بہتان | آپ کا نکتہ نمبر ۹ یہ ہے:

"حضرات خلفائے کرام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ وحی الکتاب کے اندر محفوظ ہے اور اس کے بعد حضورؐ جو کچھ کرتے تھے باہمی مشاورت سے کرتے تھے اس لیے حضورؐ کی وفات کے بعد نظام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سلطنت کی وسعت کے ساتھ تقاضے بڑھتے گئے اس لیے آئے دن نئے نئے امور سامنے آتے تھے جن کے تصفیہ کے لیے اگر کوئی پہلا فیصلہ مل جاتا جس میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی تو اسے علیٰ حالہ قائم رکھتے تھے۔ اگر اس میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے تبدیلی کر لیتے۔ اور اگر نئے فیصلے کی ضرورت ہوتی تو باہمی مشاورت سے نیا فیصلہ کر لیتے۔ یہ سب کچھ قرآن کی روشنی میں ہوتا تھا یہی طریقہ رسول اللہ کا تھا۔ اور اسی کو حضورؐ کے جانشینوں نے قائم رکھا۔ اسی کا نام اتباعِ رسول تھا"

اس عبارت میں آپ نے پے در پے متعدد غلط باتیں فرمائی ہیں۔ آپ کی پہلی غلط بیانی یہ ہے کہ رسول اللہؐ جو کچھ کرتے تھے باہمی مشاورت سے کرتے تھے۔ حالانکہ مشاورت حضورؐ نے صرف تدابیر کے معاملے میں کی ہے اور وہ بھی اُن تدابیر کے معاملے میں جن کے اختیار کرنے کا حکم آپ کو وحی سے نہیں ملا ہے۔ قرآن کی تعبیر و تفسیر، اور اس کے کسی لفظ یا فقرے کا منشا مشخص کرنے میں حضورؐ نے کبھی کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ اس معاملہ میں آپ کی اپنی ہی شرح قطعی ناطق تھی۔ اسی طرح آپ کے پورے عہدِ رسالت میں کبھی یہ طے کرنے کے لیے کوئی مشاورت نہیں ہوئی کہ لوگوں کے لیے کس چیز کو فرض و واجب، کس چیز کو حلال و جائز، اور کس

چیز کو ممنوع و حرام ٹھیرایا جاتے، اور معاشرے میں کیا قاعدے اور ضابطے مقرر کیے جائیں۔ حضور کی حیاتِ طیبہ میں تنہا آپ کی زبان اور آپ کی عملی زندگی ہی مجسّم تھی۔ کوئی مومن یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ان معاملات میں وہ حضور کے سامنے زبان کھولنے کا مجاز ہے۔ کیا آپ کوئی مثال ایسی پیش کر سکتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں قرآن کے کسی حکم کی تعبیر مشورے سے کی گئی ہو، یا کوئی قانون مشورے سے بنایا گیا ہو؟ بہت سی نہیں، صرف ایک مثال ہی آپ پیش فرمادیں۔

دوسری خلافِ واقعہ بات آپ یہ فرما رہے ہیں کہ خلفائے راشدین صرف قرآن کو منبعِ ہدایت سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کو واجب الاتباع ماخذِ قانون نہیں سمجھتے تھے۔ یہ ان بزرگوں پر آپ کا سخت بہتان ہے جس کے ثبوت میں نہ آپ ان کا کوئی قول پیش کر سکتے ہیں نہ عمل۔ اگر اس کا کوئی ثبوت آپ کے پاس ہے تو وہ سامنے لائیے۔ ان کے طرزِ عمل کی جو شہادتیں ان کے زمانے سے متصل لوگوں نے دی ہیں وہ تو یہ ہیں:

ابنِ سیرین (۳۳ھ - ۱۱۰ھ) کہتے ہیں کہ "ابوبکر کے سامنے جب کوئی معاملہ پیش ہوتا اور وہ نہ کتاب اللہ میں اس کے لیے کوئی حکم پاتے، نہ سنت میں اس کی کوئی نظیر ملتی تب وہ اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرتے اور فرماتے یہ میری رائے ہے، اگر صحیح ہے تو اللہ کا فضل ہے" (ابن القیم، اعلام الموقعین، جلد ۱، ص ۵۴)۔

میمون بن مہران (۳۷ھ - ۱۱۷ھ) کہتے ہیں، ابوبکر صدیق کا طریقہ یہ تھا کہ اگر کسی معاملہ کا فیصلہ انہیں کرنا ہوتا تو پہلے کتاب اللہ میں دیکھتے، اگر وہاں اس کا حکم نہ ملتا تو سنتِ رسول اللہ میں تلاش کرتے۔ اگر وہاں حکم مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اور اگر انہیں اس مسئلے میں سنت کا علم نہ ہوتا تو لوگوں سے پوچھتے تھے کہ کیا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس طرح کے کسی معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی فیصلہ فرمایا ہے" (کتاب مذکور، صفحہ ۶۲)

علامہ ابنِ قیم نے پوری تحقیق کے بعد اپنا نتیجۂ تحقیق یہ بیان کیا ہے کہ لا یحفظ للصدیق خلاف نص واحد ابداً "ابوبکر صدیق کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی ایک مثال بھی نہیں ملتی" (کتاب مذکور ج ۴، ص ۱۲۰)

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دادی اپنے پوتے کی میراث کا مطالبہ لے کر آئی جس کی ماں مر چکی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں پاتا جس کی رو سے تجھ کو ماں کا حصہ پہنچتا ہو۔ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس معاملہ میں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ اس پر مُغیرہ بن شعبہ اور محمد بن مَسلَمہ نے اٹھ کر شہادت دی کہ حضورؐ نے دادی کو چھٹا حصہ (یعنی حصہ مادری) دلوایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ (بخاری و مسلم)

مؤطا میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ کو اپنی زندگی میں کچھ مال دینے کے لیے کہا تھا، مگر انہیں یہ یاد نہ تھا کہ یہ مال ان کے حوالہ کر دیا گیا تھا یا نہیں۔ وفات کے وقت آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر وہ مال تم لے چکی ہو تب تو وہ تمہارے پاس رہے گا (کیونکہ وہ ہبہ ہو گیا)، لیکن اگر ابھی تک تم نے اسے قبضہ میں نہیں لیا ہے تو اب وہ میرے سب وارثوں میں تقسیم ہوگا (کیونکہ اس کی حیثیت ہبہ کی نہیں بلکہ وصیت کی ہے اور حدیث لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ کی رو سے وارث کے حق میں کوئی وصیت میت کے ترکے میں نافذ نہیں ہو سکتی تھی)۔ اس طرح کی بکثرت مثالیں خلیفۂ اوّل کی زندگی میں ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے سے بال برابر ہٹنا بھی جائز نہ رکھتے تھے۔

کون نہیں جانتا کہ خلیفہ ہونے کے بعد حضرت ابوبکر کا اوّلین اعلان یہ تھا کہ اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم "میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ لیکن اگر میں اللہ اور

اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے" کس کو معلوم نہیں ہے کہ انہوں نے حضورؐ کی وفات کے بعد جیشِ اُسامہؓ کو صرف اس لیے بھیجنے پر اصرار کیا کہ جس کام کا فیصلہ حضورؐ اپنی زندگی میں کر چکے تھے اسے بدل دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز نہ سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام نے جب آن خطرات کی طرف توجہ دلائی جن کا طوفان عرب میں اُٹھتا نظر آ رہا تھا اور اِس حالت میں شام کی طرف فوج بھیج دینے کو نامناسب قرار دیا، تو حضرت ابوبکرؓ کا جواب یہ تھا کہ لو خطفتنی الکلاب والذئاب لم ارد قضاءً قضیٰ بہ رسول اللہ "اگر کتے اور بھیڑیے بھی مجھے اُچک لے جائیں تو میں اُس فیصلے کو نہ بدلوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دیا تھا" حضرت عمرؓ نے خواہش ظاہر کی کہ کم از کم اُسامہ ہی کو اس لشکر کی قیادت سے ہٹا دیں کیونکہ بڑے بڑے صحابہ اس نوجوان لڑکے کی ماتحتی میں رہنے سے خوش نہیں ہیں، تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا: ثکلتک امک وعدمتک یا ابن الخطاب، استعملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتامرنی ان انزعہ "خطّاب کے بیٹے، تیری ماں تجھے روئے اور تجھے کھو دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقرر کیا اور تو مجھ سے کہتا ہے کہ میں اسے ہٹا دوں" اس موقع پر لشکر کو روانہ کرتے ہوئے جو تقریر انہوں نے کی اس میں فرمایا: انما انا متبع لست بمبتدع "میں تو پیروی کرنے والا ہوں نیا راستہ نکالنے والا نہیں ہوں" پھر کس سے یہ واقعہ پوشیدہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عباسؓ کے مطالبۂ میراث کو ابوبکر صدیقؓ نے حدیث رسول اللہ ہی کی بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور اِس قصور پر وہ آج تک گالیاں کھا رہے ہیں۔ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جب وہ جہاد کا فیصلہ کر رہے تھے تو حضرت عمرؓ جیسے شخص کو اس کی صحت میں اس لیے تامل تھا کہ جو لوگ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہیں ان کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جا سکتی ہے۔ مگر اس کا جو جواب انہوں نے دیا وہ یہ تھا کہ واللہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ "خدا کی قسم، اگر وہ اونٹ باندھنے کی ایک رسّی بھی اُس زکوٰۃ میں سے روکیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دیتے تھے تو میں اس پر ان سے لڑوں گا۔"

یہ قول اور یہ عمل تھا اس شخص کا جس نے حضورؐ کے بعد سب سے پہلے زمام کار سنبھالی تھی، اور آپ کہتے ہیں کہ خلفائے کرام اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے بدلنے کا مجاز سمجھتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کا مسلک اس معاملے میں جو کچھ تھا اسے وہ خود قاضی شریح کے نام اپنے خط میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اگر تم کوئی حکم کتاب اللہ میں پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کرو۔ اور اگر کوئی ایسا معاملہ آئے جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں جو حکم ملے اس پر فیصلہ کرو۔ اور اگر معاملہ ایسا ہو جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول اللہ میں تو اس کا فیصلہ اس قانون کے مطابق کرو جس پر اجماع ہو چکا ہو۔ لیکن اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں خاموش ہوں اور تم سے پہلے اس کے متعلق کوئی اجماعی فیصلہ بھی نہ ہوا ہو تو تمہیں اختیار ہے کہ یا تو پیش قدمی کر کے اپنی اجتہادی رائے سے فیصلہ کر دو، یا پھر ٹھیر کر انتظار کرو، اور میرے نزدیک تمہارا انتظار کرنا زیادہ بہتر ہے" (اعلام الموقعین، جلد ۱-ص ۶۱-۶۲)

یہ حضرت عمرؓ کا اپنا لکھا ہوا سرکاری ہدایت نامہ ہے جو انہوں نے خلیفۂ وقت کی حیثیت سے ضابطۂ عدالت کے متعلق کوفہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کو بھیجا تھا۔ اس کے بعد کسی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ ان کے مسلک کی کوئی دوسری ترجمانی کرے۔

آپ کا یہ خیال بھی محض ایک دعویٰ بلا ثبوت ہے کہ خلفائے راشدین قرآن مجید کے احکام کو تو قطعی واجب الاطاعت مانتے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں جن کو وہ باقی رکھنا مناسب سمجھتے تھے انہیں باقی رکھتے تھے اور جنہیں بدلنے کی ضرورت سمجھتے تھے انہیں بدل کر باہمی مشاورت سے نئے فیصلے کر لیتے تھے۔ آپ اس کی کوئی نظیر پیش فرمائیں کہ

خلافتِ راشدہ کے پورے دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا کوئی فیصلہ بدلا گیا ہو، یا کسی خلیفہ یا صحابی نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ ہم حضور کے فیصلے حسبِ ضرورت بدل لینے کے مجاز ہیں۔

۱۰۔ کیا حضور پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی؟

اب صرف آپ کا آخری نکتہ باقی ہے جسے آپ ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:

"اگر فرض کر لیا جائے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں کہ حضور جو کچھ کرتے تھے وحی کی رو سے کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کو اپنی طرف سے بھیجی ہوئی ایک قسم کی وحی پر (نعوذ باللہ) تسلّی نہ ہوئی، چنانچہ دوسری قسم کی وحی کا نزول شروع ہو گیا۔ یہ دو رنگی وحی آخر کیوں ہ پہلے آنے والے نبیوں پر جب وحی نازل ہوئی تو اس میں نزولِ قرآن کی طرف اشارہ تھا۔ تو کیا اس اللہ کے لیے جو ہر چیز پر قادر ہے یہ بڑا مشکل تھا کہ دوسری قسم کی وحی، جس کا آپ ذکر کرتے ہیں، اس کا قرآن میں اشارہ کر دیتا۔ مجھے تو قرآن میں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی اگر آپ کسی آیت کی طرف اشارہ فرما سکیں تو مشکور رہوں گا۔"

یہ تسلّی کی بات بھی خوب ہے گویا آپ کی رائے میں اللہ میاں بندوں کی ہدایت کے لیے نہیں بلکہ اپنی تسلّی کے لیے وحی نازل فرماتے تھے، اور ان کی تسلی کے لیے بس ایک قسم کی وحی کافی ہونی چاہیے تھی!

آپ تو "دو رنگی وحی" پر ہی حیران ہیں، مگر آنکھیں کھول کر آپ نے قرآن پڑھا ہوتا تو آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ کتاب "سہ رنگی وحی" کا ذکر کرتی ہے جن میں سے صرف ایک "رنگ" کی وحی قرآن میں جمع کی گئی ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا	کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو
وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ	کرے، مگر وحی کے طریقہ پر، یا پردے کے پیچھے
رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ	سے، یا اس طرح کہ ایک پیغام بر بھیجے اور وہ اللہ
حَكِيْمٌ۔ (الشوریٰ - آیت ۵۱)	کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو۔ وہ

برتر اور حکیم ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بشر پر احکام و ہدایات نازل ہونے کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک براہِ راست وحی (یعنی القاء و الہام)، دوسرے پردے کے پیچھے سے کلام، تیسرے اللہ کے پیغام بر (فرشتے) کے ذریعہ سے وحی۔ قرآن مجید میں جو وحیاں جمع کی گئی ہیں وہ ان میں سے صرف تیسری قسم کی ہیں۔ اس کی تصریح اللہ تعالیٰ نے خود قرآن ہی میں فرمادی ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ... فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ۔ (البقرہ - ۹۷ - ۹۸)	(اے نبی) کہو جو کوئی دشمن ہو جبریل کا اس بناء پر کہ اس نے یہ قرآن نازل کیا ہے تیرے قلب پر اللہ کے اذن سے تصدیق کرتا ہوا ان کتابوں کی جو اس کے آگے آئی ہوئی ہیں اور ہدایت و بشارت دیتا ہوا اہلِ ایمان کو... تو اللہ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔
وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ (الشعراء ۱۹۲ - ۱۹۴)	اور یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے۔ اسے لے کر روح الامین اترا ہے تیرے قلب پر تاکہ تو متنبہ کرنے والوں میں سے ہو۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ قرآن صرف ایک قسم کی وحیوں پر مشتمل ہے۔ رسول کو ہدایات ملنے کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر سورۂ شوریٰ والی آیت میں کیا گیا ہے وہ ان کے علاوہ ہیں۔ اب خود قرآن ہی ہمیں بتاتا ہے کہ ان صورتوں سے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایات ملتی تھیں۔

(۱) جیسا کہ میں آپ کے چوتھے نکتے پر بحث کرتے ہوئے بتا چکا ہوں، سورۂ بقرہ کی آیات ۱۴۳-۱۴۴ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسجدِ حرام کے قبلہ بنائے جانے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان کسی اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کا حکم دیتے ہوئے اس بات کی توثیق فرمائی کہ وہ پہلا قبلہ جس کی طرف رخ کیا جاتا تھا، وہ بھی ہمارا ہی مقرر کیا ہوا تھا

لیکن قرآن میں وہ آیت کہیں نہیں ملتی جس میں اُس قبلے کی طرف رُخ کرنے کا ابتدائی حکم ارشاد فرمایا گیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضورؐ پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں آتی تھی تو وہ حکم حضورؐ کو کس ذریعہ سے ملا؟ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ حضورؐ کو ایسے احکام بھی ملتے تھے جو قرآن میں درج نہیں ہیں؟

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے۔ آپ اس کی خبر صحابۂ کرام کو دیتے ہیں اور ۱۴ سو صحابیوں کو لیکر عُمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ کفارِ مکہ آپ کو حُدَیبیہ کے مقام پر روک لیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلح حُدَیبیہ واقع ہوتی ہے۔ بعض صحابی اس پر خلجان میں پڑ جاتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خبر دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا "کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اِسی سفر میں ایسا ہو گا؟" اس پر اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا۔ (الفتح آیت ۲۷)	اللہ نے اپنے رسول کو یقیناً سچا خواب دکھایا تھا تم ضرور مسجدِ حرام میں ان شاء اللہ داخل ہو گے امن کے ساتھ سر مونڈتے ہوئے اور بال ترشتے ہوئے بغیر اس کے کہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہو۔ اللہ کو علم تھا اُس بات کا جسے تم نہ جانتے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے اس نے یہ قریب کی فتح (یعنی صلح حدیبیہ) عطا کر دی

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کو خواب کے ذریعہ سے مکہ میں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر مکہ کی طرف جائیں، کفار روکیں گے، آخر کار صلح ہو گی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا اور آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائیگا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے ہدایات ملنے کا کھلا ثبوت نہیں ہے؟

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو راز میں ایک بات بتاتے

ہیں۔ وہ اس کا ذکر دوسروں سے کر دیتی ہیں حضورؐ اس پر باز پرس کرتے ہیں تو وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں سے کہدی ہے۔ حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے:

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ۔ (التحریم-۳)

اور جب کہ نبی نے اپنی ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی، اور اس بیوی نے اس کی (دوسروں کو) خبر دیدی، اور اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا تو نبی نے اس بیوی کو اس کے قصور کا ایک حصہ تو جتا دیا اور دوسرے حصّہ سے درگزر کیا۔ پس جب نبی نے اس بیوی کو اس کا قصور جتایا تو اس نے پوچھا آپ کو کس اس کی خبر دی؟ نبیؐ نے کہا مجھے علیم و خبیر خدا نے بتایا۔

فرمائیے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری بیوی نے تمہاری راز کی بات دوسروں سے کہدی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہؤا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغامات بھیجتا تھا؟

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ ان کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر منافقین اور مخالفین حضورؐ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک شدید طوفان اٹھا کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۂ احزاب کے ایک پورے رکوع میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہمارے نبی نے یہ نکاح خود نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے حکم سے کیا ہے۔

فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا

پھر جب زید کا اس سے جی بھر گیا تو ہم نے اس (خاتون) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہلِ ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں

مِنْهُنَّ وَطَرًا۔ کوئی حرج نہ رہے جبکہ وہ ان سے جی بھر چکے ہوں

(آیت ۳۷) (یعنی انہیں طلاق دے چکے ہوں)۔

یہ آیت تو گزرے ہوئے واقعہ کا بیان ہے۔سوال یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا گیا تھا کہ تم زید کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لو وہ قرآن میں کس جگہ ہے؟

(۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر کی مسلسل بدعہدیوں سے تنگ آکر مدینہ سے متصل ان کی بستیوں پر چڑھائی کر دیتے ہیں اور دورانِ محاصرہ میں اسلامی فوج گرد و پیش کے باغات کے بہت سے درخت کاٹ ڈالتی ہے تاکہ حملہ کرنے کے لیے راستہ صاف ہو۔اس پر مخالفین شور مچاتے ہیں کہ باغوں کو اجاڑ کر اور ہرے بھرے ثمر دار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے۔جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا فَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ (الحشر ۵) کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیے، یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی؟

(۶) جنگ بدر کے خاتمے پر جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس وقت سورۂ انفال نازل ہوتی ہے اور اس میں اس پوری جنگ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔اس تبصرے کا آغاز اللہ تعالیٰ اُس وقت سے کرتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے، اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ اور جبکہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں (یعنی تجارتی قافلے اور قریش کے لشکر) میں سے ایک تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تم چاہتے تھے کہ بے زور گروہ (یعنی تجارتی قافلہ) تمہیں ملے۔

دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ - (آیت ۷) حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی کمر توڑ دے۔

اب کیا آپ پورے قرآن میں کسی آیت کی نشان دہی فرما سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نازل ہُوا ہو کہ اے لوگو، جو مدینہ سے بدر کی طرف جا رہے ہو، ہم دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں قابو عطا فرما دیں گے؟

(۷) اسی جنگ بدر پر تبصرے کے سلسلے میں آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ (الانفال- آیت ۹)

جبکہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمہاری فریاد کے جواب میں فرمایا میں تمہاری مدد کے لیے لگاتار ایک ہزار فرشتے بھیجنے والا ہوں۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کی فریاد کا یہ جواب قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہُوا تھا؟

آپ صرف ایک مثال چاہتے تھے۔ مَیں نے آپ کے سامنے قرآن مجید سے سات مثالیں پیش کر دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ کے پاس قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ اس کے بعد آگے کسی بحث کا سلسلہ چلنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ حق کے آگے جھکنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں۔

تعارفِ کُتب

حلال وحرام | از عطاء اللہ پالوی صاحب قیمت دو روپے چار آنے ضخامت ۸۵۴ صفحات اخباری کاغذ پر مکتبۂ جدید، لاہور نے شائع کی ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ہے۔

اس ملک کے اندر مغربی افکار ونظریات کو "مشرف بہ اسلام" کرنے والوں کی کمی نہ تھی لیکن اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے باہر سے بھی برابر کمک پہنچ رہی ہے۔ چنانچہ دنیا کے کسی خطے میں جب کوئی "صاحبِ نظر" اس کام کے لیے کارآمد دکھائی دیتے ہیں تو ان کی "خدمات جلیلہ" سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زیرِ تبصرہ تصنیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ فاضل مصنف ہندوستان میں تشریف فرما ہیں لیکن اُن کے خیالات کی اشاعت پاکستان میں ہو رہی ہے۔

کتاب کا انداز تجدد پسندوں کے عام طرزِ فکر سے ملتا جلتا ہے یعنی یورپ میں فنونِ لطیفہ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور کُتا ان کے ہاں محبوب ومحمود ہے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے مغرب کی پیروی نہیں کی اس لیے وہ فنونِ لطیفہ سے بھی ناواقف رہے اور کُتا بھی اُن کا منظورِ نظر نہ بن سکا۔ ہماری اس "پس ماندگی" کے اسباب بھی پالوی صاحب نے وہی بیان کیے جو تجدد پسند عام طور پر بیان کرتے ہیں، یعنی مسلمانوں نے قرآن سے رہنمائی حاصل نہیں کی جو فنونِ لطیفہ کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ کُتے کی عظمت کا بھی معترف ہے اور انہوں نے حلت وحُرمت جاننے کے لیے حدیث کی روایتوں پر اعتماد کیا، نتیجۃً وہی روایتیں جو کُتے کو ناپاک اور مجسمہ سازی کو حرام قرار دیتی تھیں مسلمانوں پر حاوی ہو گئیں۔

مؤلف نے ازراہِ کرم اپنی وسعتِ قلبی سے کام لیتے ہوئے اس سلسلہ میں چند احادیث بھی نقل کی ہیں اور پھر انہیں عجمی سازش قرار دیتے ہوئے بزعمِ خود ان کا پردہ بھی چاک کیا ہے اس سلسلہ

میں کُتّے کی "بزرگی اور برتری" ثابت کرنے کے لیے جو واقعاتی اور تجرباتی مواد جمع کیا گیا ہے وہ چونکہ غیر قرآنی ہے اس لیے ہم اُس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے پالوی صاحب کی صرف قرآن فہمی کے چند نوادر پیش کرتے ہیں۔

پالوی صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں کُتّے کا ذکر متعدد جگہ آیا ہے۔ مثلاً اصحابِ کہف کے کُتّے کا ذکر ہے۔ شکاری کُتّوں کا ذکر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن میں اہلِ کتاب کے نالائق اور گمراہ افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی مثال کُتّے کی ہے کہ اگر اسے کھدیڑ دو تو بھی ہانپے اور یونہی چھوڑ دو تو بھی ہانپے۔ یہ آخری دلیل جو فاضل مصنّف نے کُتّے کی "عظمت" کے لیے پیش کی ہے، ان کے طرزِ استدلال کا شاہکار ہے۔ جو عقل قرآن حکیم کے اس ارشاد سے کُتّے کے عزّ و شرف کا پہلو نکالتی ہے اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فکر جب ایک مرتبہ بے لگام ہو جائے، پھر وہ گمراہی کی کن کن خطرناک وادیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

باقی رہا اصحابِ کہف کا کُتّا تو اس ایک کُتّے کی وجہ سے کُتّوں کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جملہ ممکن اوصافِ حمیدہ سے متصف تسلیم کر لینے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ وہ ایک محافظ اور چوکیدار کُتّا تھا جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ اپنے دونوں بازو غار کے دہانے پر پھیلائے بیٹھا ہے، اس کُتّے کے رکھنے کی اجازت حدیث میں بھی آئی ہے آخر اس پر ان کُتّوں کو کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے جو شوقیہ پالے جاتے ہیں اور جو پہریدار کی حیثیت میں نہیں رہتے بلکہ تختِ جگر کی طرح صاحب بہادر اور بیگم صاحبہ کی آغوش میں براجمان ہوتے ہیں۔

شکاری کُتّے کا معاملہ بھی چوکیدار کُتّے کا سا ہے۔ اس کا پالنا بھی ایک حقیقی ضرورت کے تحت آتا ہے اور اس کے رکھنے کا جواز بھی حدیث سے ثابت ہے۔ کوئی مسلمان اس کے عدمِ جواز کا قائل نہیں، سوال یہ ہے کہ ان دو قسم کے کُتّوں کے سوا اور کس قسم کے کُتّے کو رکھنے کا جواز پالوی صاحب کو قرآن میں ملا ہے، جسے پیش کر کے وہ حدیث کا معارضہ کر سکتے ہوں۔

پالوی صاحب نے سورہ مائدہ کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے انہوں نے وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ کا ترجمہ "تم نے جن کتوں کو سدھایا" کیا ہے حالانکہ جوارح سے مراد سارے شکاری جانور ہیں اور مکلبین سے مراد سدھانے والے انسان ہیں یا پھر زخمی کرنے والے (یعنی شکاری) جانور ہی مراد ہیں، بہر حال یہ آیت پالوی صاحب کے نزدیک اگر کسی عزت و شرف کی موجب ہے تو پھر اس میں دوسرے شکاری درندوں اور پرندوں کو بھی حصہ ملنا چاہیے۔ تنہا کتا ہی ساری عزت کا اجارہ دار نہیں ہے

اسی طرح انہوں نے لفظ "انعام" کے سمجھنے میں بھی سخت ٹھوکر کھائی ہے ان کی نظر میں سارے جانور انعام ہیں جن میں کتے کو نمایاں ترین مقام حاصل ہے انعام کے اس مفہوم کا تصور وہی شخص کر سکتا ہے جو پالوی صاحب کی طرح قرآن اور لغت عرب دونوں سے ناواقف ہو۔ عربی کی معمولی شدبد رکھنے والا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ لفظ انعام عربی میں اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری کے لیے بولا جاتا ہے قرآن خود سورۂ انعام میں اس معنی کی صراحت کرتا ہے۔ اردو میں مویشی کا لفظ قریب قریب اس کا ہم معنی ہے۔ بہیمہ کا لفظ اس سے وسیع تر ہے لیکن اس کا اطلاق بھی ہر جانور پر نہیں بلکہ چرنے والے چوپایوں پر ہوتا ہے۔ درندوں کے لیے ان دونوں لفظوں سے الگ سبع کا لفظ مستعمل ہے۔ سورۂ مائدہ کے آغاز میں جہاں یہ فرمایا ہے أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ، تو اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشی کی قسم کے چرند حلال کیے گئے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے حلت کے دائرہ کو وسیع تر کر دیا ہے، اس میں وہ سارے چرنے والے چوپائے داخل ہو گئے جو فی الجملہ انعام سے ملتے جلتے ہوں لیکن سخت حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ حلت کے جس دائرے کی وسعت کو اللہ تعالیٰ نے صرف مویشی یا اسی نوعیت کے چرندوں تک محدود کیا تھا اس دائرے کو اب عطاء اللہ پالوی جیسے حضرات سارے جانوروں پر محیط کر رہے ہیں اور ان کے پیش کردہ دائرۂ حلت میں کتے، بلیاں، گیدڑ، بھیڑیے اور شیر سب آ جاتے ہیں۔

پالوی صاحب کو اپنی تحقیق انیق کے پورے مضمرات سمجھنے میں بھی غلطی لگی ہے۔ اگر انعام کا مطلب اور مفہوم وہی ہے جو وہ بیان فرما رہے ہیں تو پھر انہوں نے خواہ مخواہ اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی۔ اس کی رو سے تو کیا ہر جانور کو حلال کرنے کے لیے أُحِلَّتْ لَكُم بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ کے الفاظ کافی ہیں۔ معلوم نہیں وہ کس

رنگ میں آکر اپنے اس قرآنی استدلال کو نظر انداز کر گئے۔

پالوی صاحب نے ص۴۹ میں ایک اور بھی عجیب و غریب نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"یاد رکھیے: کُتّے کو اللہ تعالیٰ نے یونہی فضول، بیکار اور لایعنی پیدا نہیں کیا۔ قرآن میں ہے مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ (آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے ہم نے اُسے بلامصلحت پیدا نہیں کیا ہے)"

فاضل مصنف اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کُتّا چونکہ آسمان و زمین کے درمیان ہے اس لیے اس کی پیدائش سراسر حق اور مبنی بر مصلحت ہے اور اس وجہ سے وہ ناپاک نہیں بلکہ حلال و طیب ہے۔ اگر کُتّا محض آسمان و زمین کے درمیان ہونے کی وجہ سے پاک ہو سکتا ہے اور انسانی محبت کا استحقاق رکھتا ہے تو پھر خنزیر بھی اسی زمرہ میں شامل ہونے کی بنا پر اسی عزّ و شرف کا مستحق ہے جو کُتّے کو دیا جا رہا ہے کیونکہ وہ بھی تو آخر اللہ ہی کی مخلوق ہے اور اسکی پیدائش بھی سراسر حق پر مبنی ہے۔ اگر پالوی صاحب کی اس نکتہ آفرینی کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر خود اللہ میاں کے کاموں میں انسان کو تضاد محسوس ہونے لگتا ہے، خالقِ کائنات ایک طرف تو خنزیر کو زمین و آسمان کے درمیان پیدا کر کے اس کی پیدائش کو سراسر حق اور مبنی بر مصلحت ٹھیراتا ہے مگر دوسری طرف اسے حرام قرار دیتا ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ پالوی صاحب نے اپنی اس نکتہ آفرینی سے قرآن مجید کے اس تضاد کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ حدیث کے بعد قرآن سے بھی مسلمانوں کا پیچھا چھوٹ جائیگا اور مغربی تہذیب کے سیلاب میں وہ زیادہ اطمینانِ قلب کے ساتھ بہ سکیں گے۔

یہ ہے اس فکر و بصیرت کا ایک نادر نمونہ جو خالص قرآن کے "غیر متبدل اصولوں" سے فیض یاب ہونے اور عجمی روایات کی بندشوں سے آزاد اور فقہاء کی نکتہ آفرینیوں سے بے نیاز ہو کر پیدا ہوتی ہے کُتّے کی اس بحث کے بعد پالوی صاحب نے فنونِ لطیفہ کی طرف اپنے رہوارِ فکر کا رُخ پھیرا ہے اور فرماتے ہیں:-

"یہ ناممکن ہے کہ قرآن اور محمدؐ کا مسلک فنونِ لطیفہ کے بارے میں وہی ہو جو کسی ناواقفِ فطرتِ انسانی کا ہو سکتا ہے اس لیے ایک لمحے کو بھی وہم و گمان میں یہ بات نہیں لائی جا سکتی کہ اسلام اور اسکے دستور العمل قرآن اور اس کے لانے والے برگزیدہ انسان محمد رسول اللہ نے مسلمانوں کے لیے

مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی اور شاعری وغیرہ کو حرام یا ممنوع قرار دیا ہو۔"

اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آرٹ انسان کی ایک فطری امنگ ہے جس سے کوئی فرد بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہم لازمی طور پر آرٹ کے انہی مظاہر کو اپنائیں جو ہمیں مادہ پرستانہ تہذیب نے دیئے ہیں اور انہیں قرآن مجید سے کسی نہ کسی طرح جائز ٹھہرانے کی کوشش کریں۔ پھر ہمیں ان کی یہ بات بھی عقل و فکر کے بالکل منافی معلوم ہوتی ہے کہ "مجسمے کا تعلق محض فن سے ہے عقیدے سے نہیں۔ اور دنیا میں ہر جگہ مجسمے فنی حیثیت ہی سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی پرستش نہیں ہوا کرتی، پرستش کا تعلق تو دل اور دماغ سے ہے۔" اگر پرستش کا تعلق دل و دماغ سے ہے تو پالوی صاحب براہِ کرم یہ بتائیں کہ فن کا تعلق ہماری زندگی کے کس حصے سے ہے ہم تو آج تک یہی پڑھتے چلے آئے ہیں کہ فن کا ذوق و وجدان سے نہایت گہرا رشتہ ہے اور یہ ذوق و وجدان دل و دماغ کے اندر ہی پرورش پاتا ہے ہمیں یقین ہے کہ پالوی صاحب اگر یہ ثابت کر دیں کہ فن کا دل و دماغ سے رابطہ نہیں بلکہ جسم کے کسی اور حصے سے تعلق ہے تو ان کی یہ تحقیق بڑی ہی لاجواب ہوگی اور پوری دنیا سے دادِ تحسین وصول کرے گی۔

پالوی صاحب نے خیر و شر کے بارے میں بھی ایک بڑا لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ علامہ پرویز صاحب کے حوالے سے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اسلام صرف یہ ہے کہ جس چیز میں خیر کا پہلو ہو وہ لے لو اور جو شر کا پہلو ہو وہ چھوڑ دو اور فی نفسہٖ اپنی ذات سے کوئی بھی چیز، کوئی بھی فن، کوئی بھی صنعت، کوئی بھی شوق نہ خیر ہے نہ شر۔۔ فنونِ لطیفہ کا کوئی سا بھی شعبہ چاہے وہ تصویر کشی ہو یا مجسمہ سازی، رقص ہو یا موسیقی، نہ فی نفسہٖ بُرا ہے اور نہ ہرگز اسلام نے ان کو حرام یا ممنوع قرار دیا ہے، کیونکہ ان کا تعلق فطرتِ انسانی اور تمدنی زندگی سے ایسا گہرا ہے کہ اسے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔" شیکسپیئر نے شاعرانہ ترنگ میں آکر یہ بات کہی تھی کہ کوئی چیز فی نفسہٖ نہ اچھی ہے نہ بُری بلکہ ہمارا احساس اسے ایسا بناتا ہے لیکن پالوی صاحب کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے اس سے خیر و شر کے پیمانے متعین کرنے میں مدد لی ہے، اگر خیر و شر محض ہمارے اپنے داخلی احساسات کا عکس ہے تو پھر ان اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے بکھیڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے بعد تو قرآن مجید کی طرف بھی رجوع کرنا سراسر تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اسلام بس اپنے "من" کی پیروی کا نام رہ جاتا ہے۔ اور اسی سے ہر فعل کے جواز کا

فتویٰ لیا جا سکتا ہے۔ غور کیجیے اس قسم کی نکتہ آفرینیاں ہمیں کس مقام تک لے جاتی ہیں۔ پالوی صاحب نے مجسّمے کو جائز قرار دینے کے لیے قرآن مجید سے جس طرح استدلال کیا ہے اُسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ صفحہ ۱۲۶ پر آیت مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ نقل کرنے کے بعد صفحہ ۱۲۷ پر یوں رقمطراز ہیں:۔

"اب زیر بحث آیت کا ترجمہ اُردو میں سنیے: (وہ) جو کچھ سلیمان چاہتے وہ جنات تیار کر دیتے، مثلاً قلعے اور مجسّمے ... تماثیل کہتے ہیں تصویروں کو، یہ تانبے کی تھیں اور بقول قتادہ وہ مٹی اور شیشے کی تھیں۔" (تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ)

اب یہ عبارت ایسی ہے جس کے شروع میں یہ لکھا ہے کہ یہ آیت کا ترجمہ ہے اور آخر میں یہ لکھ دیا ہے کہ یہ تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ ہے۔ اس تلبیس کا مقصود بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک قاری اگر اسے تفسیری عبارت خیال کرے گا تو دوسرا اسے آیتِ قرآنی کا ترجمہ سمجھ بیٹھے گا۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کیلیے جن تماثیل کے بنائے جانے کا ذکر ہے ان سے جابجا پالوی صاحب نے تصاویر، انسانی مجسمے یا جانداروں کے مجسّمے مراد لیے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایسی کوئی تصریح موجود نہیں ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ تماثیل سے مراد بے جان اشیاء یا مناظر کی تصاویر نہ لی جائیں اور خواہ مخواہ انہیں جانداروں کے مجسّمے ہی سمجھا جائے۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ جانداروں ہی کے مجسّمے تھے تب بھی علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زندگی کے جن معاملات کے بارے میں خدا کی آخری کتاب اور اس کے آخری رسولؐ کی سنت میں واضح احکام آ گئے ہیں ان معاملات میں سابق شرائع ہمارے لیے حجت نہیں ہیں۔ تصویر اور مجسّمے کے بارے میں چونکہ سنتِ محمدیہ میں صریح احکام موجود ہیں اس لیے اس معاملے میں سابق شریعت کے کسی مجمل اور ذومعنی جزئیے سے استشہاد کیسے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔

پالوی صاحب مجسموں کے بارے میں اپنے اس غلط موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی تعلیمات ہمیشہ ایک ہی ہیں یعنی جو بھی پیغمبر آئے ان کی تعلیمات اصولی حیثیت سے ایک تھیں۔ شریعت اللہ تعالیٰ مقرر کرتا ہے پیغمبر نہیں۔"

لیکن ان کی یہ بات تب ہی صحیح مانی جا سکتی ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر

نبی پر نازل کردہ تعلیمات، کلیات اور جزئیات دونوں لحاظ سے عین بعین یکساں تھیں لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں اور خود قرآن نے اس کی تردید کر دی ہے۔ قرآن مجید سابق کتب کی بعض آیات کے منسوخ کرنے اور ان کے مثل یا ان سے بہتر لانے کا اعلان کرتا ہے۔

اس معاملہ میں بھی لطف کی بات یہ ہے کہ پالوی صاحب نے اپنے اس پیش کردہ کلیے کے بارے میں بھی ایک جیسی روش اختیار نہیں کی تصویر اور مجسمے کی بحث میں تو وہ شرائع کے جزوی اختلافات کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس کے مان لینے سے تماثیل کے متعلق ان کا استدلال غلط ہو جاتا ہے لیکن آگے "اکل و شرب" کی بحث میں دخترِ رز کو حلال ٹھہرانے کے لیے وہ اسی حقیقت کو آگے بڑھ کر خود تسلیم کر لیتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"جس خدا نے اپنے کسی رسول کے ذریعے سے کسی چیز کو ان پر حرام کر دیا تھا اسی خدا نے اپنے دوسرے رسول حضرت عیسٰیؑ کی معرفت احکام بھیج کر ان پر بعض چیزیں حلال کر دی تھیں"۔

تصویر کشی اور بُت گری کے بعد ایک باب انہوں نے رقص و موسیقی کے لیے بھی وقف کیا ہے اس میں وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا کی آیت نقل کر کے پیچھے توراۃ کے حوالوں اور علامہ عبدالحلیم شررؔ کی تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ "حضرت داؤد علیہ السلام گانے بجانے کے رسیا تھے۔ انھوں نے مذہبی رسوم کے لیے موسیقی کی چوکیاں اور بینڈ مقرر کیے، عبادت کے وقت وہ خدا کے سامنے ناچتے اور گاتے"۔ ہمیں ان لوگوں کے اس طرزِ استدلال کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے سامنے جب قولِ رسولؐ، صحابہؓ، تابعینؒ اور محدثینؒ کے مستند حوالوں سے پیش کیا جاتا ہے تو یہ بڑے ہی مغرورانہ انداز میں اُسے ٹھکراتے ہوئے کہتے ہیں "ہمارے سامنے قرآن سے سند لاؤ"۔ لیکن جب ان کی اپنی باری آتی ہے تو قرآنی آیات کی تشریح کی آڑ میں محرّف کتابوں اور تیسرے درجے کے عامیانہ مضمون نگاروں کے حوالوں پر اعتماد کرنے میں بھی قطعاً کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

یوں تو یہ ساری کتاب ہی "لطائف" کا مجموعہ ہے لیکن شراب کے ضمن میں انہوں نے جو طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ تو انتہائی دلچسپ ہے صفحہ ۲۵ ،۲۵۲ پر وہ فرماتے ہیں "جن بیا چیزوں

کو قرآن نے حرام کیا ہے اُن میں شراب کا کوئی ذکر نہیں" پھر کہتے ہیں" شراب کے لیے اصطلاحاً حرام کا لفظ بولا جا سکتا ہے اگرچہ اس کا ذکر حرام چیزوں میں نہیں اور ہر چند شراب کے فائدوں سے بھی قرآن کو انکار نہیں" پھر کہتے ہیں" ایک مسلمان کا قطعی طور پر شراب سے پرہیز کرنا لازم ہے، مگر عجیب بات ہے کہ شراب کی حرمت میں غلو سے کام لیا گیا ہے اور غلو بجائے خود ممنوع ہے اور غلو یہ ہے کہ شراب ہی کو نہیں بلکہ نشہ کو حرام بتایا گیا ہے" ان ساری نکتہ آفرینیوں کے بعد پالوی صاحب شراب کے نشے اور افیون، بھنگ وغیرہ کے نشے میں ایک باریک مگر انوکھا فرق بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ" شراب کے نشے میں انسان اوندھے منہ یعنی منہ کے بل گرتا ہے، دوسرے نشے میں یہ بات نہیں۔ آج تک کسی شرابی کو کروٹ کے بل یا چِت گرتے نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح دوسری نشے والی چیزیں پینے والے کو منہ کے بل گرتے نہیں دیکھا گیا"

اب منہ کے بل گرنے سے اور چِت گرنے سے حلّت و حرمت کے احکام میں جو فرق پیدا ہوتا ہوگا اسے پالوی صاحب نے صیغۂ راز ہی میں رکھا ہے۔ وہ غالباً یہ چاہتے ہیں کہ قارئین خود اس کا منشا اور مدعا سمجھیں اور تجربہ سے اس نکتے کی باریکیاں سمجھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اسلام تجربہ اور مشاہدہ کا دین ہے" اس لیے جس نشے سے وہ اوندھے منہ گریں اس سے تو پرہیز کریں، لیکن جس نشے سے فقط چِت گریں اُسے بغیر کسی مضائقہ کے استعمال میں لائیں۔ پوری کتاب اسی قسم کی لغویات سے بھری پڑی ہے۔ اس کے پیش کردہ مواد، طرزِ استدلال اور اسلوبِ بیان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے کسی جہت سے بھی فائدہ مند کہا جا سکے۔ اس کے پڑھنے سے البتہ ایک فائدہ ضرور ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص بھی یہ معلوم کرنا چاہے کہ انکارِ سنّت سے آدمی کے دین اور اس کی عقل پر خدا کی کیسی پھٹکار پڑتی ہے وہ اس میں عبرت کے بہت سے پہلو تلاش کر سکتا ہے۔

مکتبۂ جدید نے اسے شائع کرکے دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے سخت ٹوٹے کا سودا کیا ہے۔ کاروباری مصلحتیں اپنی جگہ پر درست ہی سہی لیکن ان کے زیرِ اثر آدمی اتنا بے حس تو نہ ہو جانا چاہیے کہ وہ صریح منکرات کے پھیلانے کا ذریعہ بن جائے۔

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

چند امتیازی پہلو

● — زبان سلیس اور انداز بیان دور حاضر کے ترقی یافتہ ادبی ذوق کے مطابق ہے ۔ ترجمہ میں روانی اس حد تک ہے کہ آدمی اگر اسے مسلسل پڑھتا جائے تو اسے ایک مربوط اور موثر کلام کا پورا کیف حاصل ہوتا ہے ۔

●● — ہر سورہ کے آغاز میں ایک تمہیدی نوٹ دیا گیا ہے جس میں سورہ کا زمانہ نزول ، تاریخی پس منظر اور وقت کا سیاسی ماحول قاری کے سامنے رکھ دیا گیا ہے نیز سورہ کے مرکزی مضمون کو بطور خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے ۔

●●● — اہم قرآنی اصطلاحات ، خاص خاص عبارات ، مطالعہ قرآن کے دوران میں پیدا ہونے والے مسائل اور تاریخی واقعات کی وضاحت حواشی میں کر دی گئی ہے ۔

●●●● — قرآن کے بیان کردہ تاریخی حقائق خواہ وہ انبیائے ماسبق سے تعلق رکھتے ہوں یا حضور خاتم النبیین کے کارنامۂ حیات سے متعلق ہوں ، ان کو سمجھنے کے لئے نہایت مفید نقشے بلاکوں سے طبع کرا کے شامل کئے گئے ہیں ۔

●●●●● — شروع میں مقدمہ و دیباچہ میں فاضل مولف نے وہ باتیں بیان کی ہیں جو قرآن فہمی کے لئے کلید کی حیثیت رکھتی ہیں ۔

●●●●●● — ہر جلد کے آخر میں اسمائے اعلام اور اصطلاحات قرانی کا تفصیلی انڈکس شامل ہے جس کی مدد سے کسی بھی موضوع پر متفرق قرآنی آیات کو بیک نظر دیکھا اور جمع کیا جا سکتا ہے ۔

ہدیہ

جلد اول سورہ الفاتحہ سے سورۃ الانعام تک ۔ ۱۵/- روپے

جلد دوم سورۃ الاعراف سے سورہ بنی اسرائیل تک ۱۸/۴ روپے

تفسیر سورہ نور (الگ کتابی سائز پر) قسم اول ۶/- روپے

قسم دوم ۴/۸ روپے قسم سوم ۳/۴ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۱۱ - سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور